ناقوس

شاعری

راج بلدیو راج



مکتبہ دانش ——— گنپت روڈ لاہور

انتساب

ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیرؔ کے نام

راج بلدیو راج بی۔ اے

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام محمد توقیر طاہر پرنٹر و پبلشر چھپکر مکتبۂ دانش
مزنگ لاہور سے شائع ہوا ہو

پیش نظم

میں کسی بھی کتاب کا دیباچہ نہیں پڑھتا۔ آپ ضرور پوچھیں گے کیوں؟ اس لیے کہ مصنف دیباچہ نگار کی اوٹ لے کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔ دیباچہ فن اور تنقید کے اصولوں سے ہٹ کر ایک رسمی سی تحریر بن کر رہ گیا ہے۔ جس کے دریچوں سے جا بجا دیباچہ لکھوانے والوں کا بے جا اثر ورسوخ اور دیباچہ لکھنے والوں کی مجبوریاں جھانکتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہر کتاب کا دیباچہ نگار مصنف کے نام کے ساتھ ایسے ایسے بے جا القاب چسپاں کر دیتا ہے جنکا بوجھ مصنف کے نازک کندھے نہیں اٹھا سکتے۔

بعض بعض جگہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کوئی مصنف بھی پروپیگنڈہ کے بغیر زندہ نہیں رہتا اور اسکی زندہ مثال منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب آپ پروپیگنڈے کی بلندی سے مصنف کے کام پر نظر کرتے ہیں تو اسکی کھوکھلی تعمیریں لرزتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مصنف کا پروپیگنڈا خود اسکی تحریر کرتی ہے۔ کتاب بُری ہو یا بھلی ہر پڑھنے والا خود اسکی قدر و منزلت جان لیتا ہے۔

کسی نے پوچھا تھا "آج تم شعر کیسے کہتے ہو، کیوں کہتے ہو، اور کس کے لئے کہتے ہو؟"

شعر کیسے کہتا ہوں؟ جب احساسات اور خیالات کے لطیف عکس ذہن پر گراں محسوس ہونے لگتے ہیں تو الفاظ کے آئینہ خانوں کے در استقبال کے لئے وا ہو جاتے ہیں۔ تصویریں نغموں کے اُتار چڑھاؤ میں ڈھلتی جاتی ہیں۔ ہونٹ تھرتھراتے ہیں۔ آنکھیں کبھی نم آلود ہوتی ہیں اور کبھی مسکراتی ہیں۔ نغموں کی لہروں سے فضا میں ایک مدو جزر پیدا ہوتا ہے جس کے اثر سے لوگ واہ واہ کر اُٹھتے ہیں لیکن شعر کے پردے کے پیچھے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں کون دیکھتا ہے؟— کون دیکھ سکتا ہے؟ کسی نے کوشش ہی نہیں کی۔ کبھی آپ خاموش رہتے ہیں اور شعر کی اوٹ میں ہنستی ہوئی آنکھوں کی خوشی کو نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر، شعر اور سامع میں کیسا عجیب رشتہ ہے؟

شعر کیوں کہتا ہوں؟ آپ اپنی زندگی کے واقعات کو بے زبان قہقہوں یا آنسوؤں میں بیان کرتے ہیں۔ شاعر انہی تصویروں کو نغمے کی گویائی بخشتا ہے۔

شعر کس کے لئے کہتا ہوں؟ کاش میں یہ کہہ سکتا کہ شعر ان لوگوں کے لئے کہتا ہوں جو انہیں سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

یا نہیں کر سکتے یہ تو خیر کون جانتا ہے۔

بہرحال اشعار زندگی کے آئینہ دار ہیں اور زندگی میں مایوسیاں زیادہ ہیں اور خوشیاں کم۔ آپ مایوسیوں کا اظہار کرنے کو زندگی سے فرار کہتے ہیں لیکن میں اپنے مستقبل کی باگ ڈور دوسروں کے حوالے چھوڑ دینے والوں کو زندگی سے راہ فرار تلاش کرنے والے سمجھتا ہوں۔ زندگی ہمیشہ تلخ رہی ہے اور رہے گی۔ اور زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر جھوٹی امیدوں کا سہارا لینا اگر زندگی سے فرار نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ زندگی کی مایوسیوں کو دیکھتے ہوئے اور محسوس کرتے ہوئے زندہ رہنا ہی زندگی ہے۔ جد و جہد کرنے والے کے پیش نظر جہاں ناکامیاں ہوتی ہیں وہاں اس کا منتہائے زندگی کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔

۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو پیدا ہو کر آج تک جتنا بھی تھوڑا بہت غم —— کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں —— زمانہ مجھے بخش سکا ہے شعروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اجاگر ہو گیا ہے۔ یہ دردانگیز گیت دنیا نے مجھے بخشے تھے اور اسی کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

یہ میرا پہلا مجموعہ ہے اور آپ اس میں اچھے برے سبھی قسم کے اشعار پائیں گے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے اہل نظر حضرات کی خدمت میں

حاضر ہے۔ اگر ان کی پسند کے معیار پر پورا اتر سکے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ آخر میں مجھے شکریہ ادا کرنا ہے جناب احسان دانش کا۔ جنہوں نے میرے ذوقِ شعری کی پرورش کی۔ وہ میرے دوست بھی ہیں اور بزرگ بھی۔ میں شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی کا بھی تہِ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے میرے پرانے کلام پر نظرِ ثانی کی زحمت گوارا فرمائی۔

۶ر فروری ۱۹۴۴ء راجؔ

فہرست

غزل

میں جی رہا ہوں تیرا سہارا لیئے بغیر
یہ زہر پی رہا ہوں گوارا کیئے بغیر

بِکتا نہ کاشِ عشق کی قیمت لیئے بغیر
میں اُن کا ہو گیا انہیں اپنا کیئے بغیر

واقف تو ہوں وفا کے نتیجے سے ہمنشیں
بنتی نہیں ہے اُن پہ بھروسا کیئے بغیر

کیا زندگی ہے اہلِ گلستاں کی زندگی
گُل ہنس رہے ہیں چاک گریباں سیئے بغیر

دن رات ہم نے غم کی حفاظت تو کی مگر
دُنیا نہ رہ سکی ہمیں رسوا کیئے بغیر

مرنے کی آرزو مجھے مدّت سے ہے مگر
لیکن یہ کام ہو نہیں سکتا جیئے بغیر
اُن کی نگاہِ مست کے صدقے ہیں مدّتوں
اک بے خودی کا دَور رہا ہے پیئے بغیر
برقِ چمن! حدودِ چمن سے نکل کے دیکھ
تاریک ایک اور بھی گھر ہے دیئے بغیر
اے رازؔ راس آ نہ سکی محفلِ حیات
ہم آ گئے تھے کس کی اجازت لیئے بغیر

"یونہی سہی"

سردِ آہوں کے خزینے کو لٹا دوں گا ندیم
یعنی تعمیرِ جوانی کو مٹا دوں گا ندیم
دل کے ساغر میں جو باقی ہے مئے نابِ شباب
قطرہ قطرہ صفتِ اشک بہا دوں گا ندیم
تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی

گلشنِ حُسن سے اک پھول چنوں گا نہ کبھی
نغمۂ عیش پہ اب سر کو دھنوں گا نہ کبھی
بیٹھ جاؤں گا رہِ عشق میں مانندِ غبار
بھول جاؤں گا تجھے، تجھ کو بھلا دوں گا ندیم
تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی

دل کی دھڑکن کو سکھا دوں گا مؤثر ہونا
عشق کے زہد سے سیکھوں گا میں کافر ہونا
دل میں موہوم امنگوں کے جو باقی ہیں نقوش
دستِ حرماں سے بیک لمحہ مٹا دونگا ندیم
تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی

صبحِ زر کار برستی ہوئی جب آئے گی
مجھ کو تنہائی میں افسردہ نظر پائے گی
میرے احساس کو بھڑکائے گی حالت میری
اپنی ہر سانس کو اک آہ بنا دونگا ندیم
تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی

شام جب رات کے دامن کا سہارا لے گی
مست و مخمور گھٹا مجھ کو صدائیں دے گی

وقف میں ہوں گا مگر رنج و مصیبت کیلئے
اپنی محرومی کو ہر لمحہ بڑھا دونگا ندیم
تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی

ظلمتِ شب کی بکھرتی ہوئی خاموشی میں
اہلِ عالم کی نکھرتی ہوئی مدہوشی میں
چھپ چھپا کر مجھے جب ملنے نہیں آؤ گے
گرم اشکوں میں لہو دل کا بہا دونگا ندیم
تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی

شہر سے دور جہاں ملتے تھے ہم تم دونوں
مئے الفت کے لنڈھاتے تھے جہاں خم دونوں
وہ فضا پوچھے گی مجھ سے جو محبت کا مآل
رہ کے خاموش یہ افسانہ سنا دوں گا ندیم

تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی
اب اگر کوئی سرِ راہ بلائے گا مجھے
تیری الفت کے نئے راز بتائے گا مجھے
اور پھر پوچھے گا مجھ سے مرے غم کا باعث
کچھ نہ بولوں گا فقط سر کو جھکا دوں گا ندیم
تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی
اپنی تقدیر کے بے درد نظارے کی قسم
دل کے ٹوٹے ہوئے پُرکیف سہارے کی قسم
اشکِ خونیں کے چراغوں سے شرارے لے کر
خرمنِ زیست کا سرمایہ جلا دونگا ندیم
تیری مرضی ہے اگر یہ ہی تو پھر یونہی سہی

غزل

کوئی پردہ میانِ عشق حائل ہو نہیں سکتا
یہ حد ہے تو بھی اب مدِّ مقابل ہو نہیں سکتا

ترا عہدِ محبّت ٹوٹ کر عہدِ محبّت ہے
مگر دل ٹوٹ جاتا ہے تو پھر دل ہو نہیں سکتا

محبّت میں پرستش کا مقام اونچا سہی لیکن
یہ عنصر انسان کی فطرت میں شامل ہو نہیں سکتا

مرے عزمِ سفر میں یہ ترا حسن سکون افزا
چراغِ راہ بن سکتا ہے منزل ہو نہیں سکتا

گرایا ہے نظر کی اس بلندی سے مجھے تو نے
میں اب اپنی نگاہوں کے بھی قابل ہو نہیں سکتا

"جواں مرگ راج[1] سنگھ"

آج کالج کی فضا سرتا بسر بے نور ہے
آنکھ ہر بالغ نظر کی اشک سے معمور ہے
جس طرف بھی دیکھئے ہے سوگواری کا سماں
بزمِ کالج، اور نحوِ رنج و حرماں؟ الاماں
نوجواں اور رنج وغم میں اس طرح افسردہ حال
یہ شبابی رونقیں اور اس طرح بے قیل و قال
نغمہ زار اور خامشی ہی خامشی؟ اندھیر ہے
اضطرابِ زندگی میں بے حسی؟ اندھیر ہے
محفلِ علم و ادب، اور اس طرح خاموش ہو
بزمِ گل، افسوس ویرانی سے ہم آغوش ہو

[1] کالج کا ایک دوست جو عین جوانی ہی میں ۱۹۴۰ء میں فوت ہو گیا۔

رُخ سے کیوں رنگِ بشاشت مائلِ پرواز ہے
زندگی کے ارغنوں میں موت کی آواز ہے
راج سنگھ افسوس اب اس دارِ فانی میں نہیں
روح کا طائر کسی قیدِ مکانی میں نہیں
چل دیا سوئے عدم بزمِ جہاں کو چھوڑ کر
باپ کی بوڑھی کمر کو، ماں کے دل کو توڑ کر
وہ دلہن اب تک نہیں باسی ہوا جس کا سہاگ
گونجتے ہیں جس کے کانوں میں ابھی شادی کے راگ
آج تک جاگی نہیں جس کی جوانی خواب سے
شوق کے جذبے نہیں نکلے دلِ بیتاب سے
جس کی آنکھوں میں ابھی شرم و حیا کا رنگ ہے
جس کی حسرت میں ابھی جوشِ وفا کا رنگ ہے

جسکے چہرے سے ٹپکتا ہے ابھی رنگِ شباب
جسکی آنکھوں سے برستی ہے محبّت کی شراب

جسکے ہونٹوں پر ابھی رقصاں ہے افسونِ جمال
ہر ادا ہے جسکی جادو، ہر نظر جس کی کمال

آہ اسکی آرزوؤں کا جہاں خاموش ہے
چُپ زمیں کو لگ گئی ہے آسماں خاموش ہے

باپ جسکی آرزوؤں کا سہارا تھا وہی
جسکے دل کا نور اور آنکھوں کا تارا تھا وہی

اس ضعیفی میں جواں اولاد کا غم ہائے ہائے
ہائے یہ بوڑھی زباں اور حرفِ ماتم ہائے ہائے

ناتواں سینے میں یہ سیلِ رواں فریاد کا
ایسے غم کو تو کلیجا چاہیئے فولاد کا

اس سبزہ خانے میں ہر شاہ و گدا مجبور ہے
آخری پیغام دینے پر قضا مجبور ہے
زندگی ہے چاندنی راتوں میں دیوانے کا خواب
موت، دورِ زندگانی میں پیامِ انقلاب
زندگی فطرت میں ارمانوں کی اک تمہید ہے
موت ارمانوں کی اس تمہید کی تردید ہے
زندگی ہے بابِ اول رنج کی تفسیر کا
موت ہے نام اس پریشاں خواب کی تعبیر کا
زندگانی بزم میں گویا چراغِ شام ہے
موت اس بزمِ حسیں کی برہمی کا نام ہے
زندگی موجوں کا دریاؤں میں اندازِ خرام
موت ہے بادِ مخالف کا خروشِ انتقام

زندگانی موت ہی کے ایک رُخ کا نام ہے
موت کیا ہے؟ زندگی کا دردناک انجام ہے
زندگی اک عارضی تعمیر ہے کچھ بھی نہیں
موت اس تعمیر کی تقدیر ہے کچھ بھی نہیں

غزل

اشکِ محبت لرزاں لرزاں، ضبطِ تمنّا محکم محکم
مانا کچھ ہے تیرا بھی غم، لیکن اپنے غم سے کم کم

اہلِ نظر کے مشرب میں ہے حُسن سے بڑھ کر عشق کا ماتم
حُسن کی شوخی فردا فردا، عشق کی عظمت عالم عالم

سحرِ محبت کا کیا کہنا دونوں طرف ہر آن یہ عالم
عشق اِدھر مجبورِ وفا ہے حُسن اُدھر ہے یوں ہم برہم

ایسی راہوں سے گذرے ہیں ذرّہ ذرّہ تھا اک منزل
عشق کے صدقے یہ دن آیا ورنہ کہاں تم اور کہاں ہم

مقصدِ ہستی عشق ہے لیکن، عشق کا حاصل اور ہی کچھ ہے
عشق ازل سے تا بہ ابد ہے، عرصۂ ہستی لغزشِ پیہم

تیری نظر کے آئینے میں عکسِ جہاں تو کیسا ہے؟

نقشِ مروّت نکھرے نکھرے، نقشِ محبّت مدھم مدھم

سامنے اُن کا روئے مُبیں ہے، کاش یہی ہو موت کی ساعت

نیند بھی ہے آنکھوں میں غلطاں، دردِ محبّت بھی ہے کم کم

چاروں طرف ہیں جلوے ہی جلوے، شبنم و گُل، مہتاب و کواکب

دید کے قابل ہے یہ تماشا کون کہاں ہوتا ہے مدغم

وقت کا ہر کارہ گونگا ہے، کون بتائے اب میں کہاں ہوں

مطلعِ عالم رنگیں رنگیں، دل کا چراغاں مدھم مدھم

احساسِ تغیّر

تغیّر کے شعلوں کی ضیا دیکھ رہا ہوں
بجھتا ہوا فانوسِ قمر دیکھ رہا ہوں
بیمار ستاروں کا سفر دیکھ رہا ہوں
تدبیر پہ گردش کا اثر دیکھ رہا ہوں

کیا پوچھتے ہو مجھ سے میں کیا دیکھ رہا ہوں
سینے میں ہر اک سانس ہے آہوں کا سفینہ
آیا ہوں میں رُودادِ المناک سنانے
ہونٹوں پہ مچلتے نہیں بیتاب ترانے
اوراقِ محبت میں ہیں افسردہ فسانے

ہے عقل کے ماتھے پہ ندامت کا پسینہ
چھپتے نہیں نظروں میں ضیا تاب مناظر

بھیگی ہوئی برسات لگا ہو نہیں ہے رقصاں
اک ابھری ہوئی شب ہے تصوّر میں خراماں
تھا کانپتے ہاتھوں میں وہ بھیگا ہوا داماں

پہلے سے مرے شعر نہ پہلا سا ہیں شاعر
خود طائرِ تخئیل کے پر نوچ رہا ہوں

دلبستگیٔ حُسن سے بیگانہ ہوں شاید
ناواقفِ ادراک ہوں دیوانہ ہوں شاید
میں اپنی تباہی کا خود افسانہ ہوں شاید

یہ سوچتا رہتا ہوں میں کیا سوچ رہا ہوں
میں کشمکشِ زیست سے تنگ آیا ہوا ہوں

اک سخت مصائب کے پھیلتے ہوئے دھارے
اک سمت الم کے ہیں سیہ سرخ شرارے
کوئی نہیں اپنا کسے انسان پکارے

اللہ کدھر جاؤں میں گھبرایا ہوا ہوں
کچھ مجھ کو نہیں پھولنے پھلنے کا سلیقہ

اس فکر میں ہوں اشک بہاتا رہوں کب تک
یہ زہر سمجھ بوجھ کے کھاتا رہوں کب تک
مرنے کے تخیّل کو بھلاتا رہوں کب تک

بجھنے کا سلیقہ ہے نہ جلنے کا سلیقہ

غزل

آزادیٔ غم ہے مجھے اِس دور میں حاصل
آزاد کوئی جبیں ہے نظر ہے نہ کوئی دل

ہے دور بہت دیر و حرم سے مرا معبد
زُنّار کا بندہ ہوں نہ تسبیح کا قائل

تو رفعتِ پروازِ تخیّل پہ ہے نازاں؟
درپیش ہیں تجھ کو تو خدائی کے مراحل

تو بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے ہے لرزاں
اور موج کے آغوش میں مستور ہے ساحل

تقدیر کی بنیاد پہ تدبیر ہے قائم
تقدیر کی تعمیر ہے تدبیر کا حاصل

سرمایے کی پستی و بلندی ہے برابر
دونوں ہی پریشان ہیں سلطاں ہو کہ سائل

تعمیر تو مانا کہ بڑی چیز ہے لیکن
تخریب بھی ہے قسمتِ تعمیر میں داخل

تو چاہے تو تلوار کی قسمت کو جگا دے
تجھ میں وہ جھلکتا ہے ابھی جوہرِ قابل

ہے عشق کے ہنگامے کی بنیاد مِن و تو
دونوں ہیں خطاوار تری آنکھ مرا دل

بے سرخی و بے رنگ ہے افسانۂ ہستی
جب تک کہ لہو دل کا نہ اشکوں میں ہو شامل

جرأت کو بڑھا دیتی ہے زنجیر کی جھنکار
زنداں بھی ہے اک مکتبِ آزادی کامل

زنداں کی طرف چل تو سہی جوشِ وفا میں
زنداں سے نکلوائیں گے خود طوق و سلاسل

موجوں کے تلاطم سے اسد وار گذر جا
گرداب نہ بن جائے کہیں حُسن کا ساحل

بے باک ارادے ہیں اگر ساتھ سفر میں
آ کر ترے قدموں سے لپٹ جائیگی منزل

مشکل نہیں کچھ چیز بھی اس بزمِ جہاں میں
آسانیٔ دشوار کو کہہ دیتے ہیں مشکل

ناداں تجھے دُنیا میں کہیں خوار نہ کر دے
یہ موسمِ بیکار میں تزئینِ محافل

مانا کہ عجب شے ہے غمِ عشق و غمِ دوست
یہ شرط ہے اس میں غمِ ہستی نہ ہو شامل

احساسات

جب غیرت کے چبھتے نشتر خوابوں سے مجھے جگائیں گے
جب رس بھرے نغموں کے دھارے شعلوں کی لپٹ بن جائیں گے
سرمائے کے اونچے محلوں پر ظلمت کی گھٹائیں چھائینگی
اور شمعِ الم کو گُل کرنے پُر شور ہوائیں آئیں گی
صیاد کی دُنیا میں سچ مچ اک شور بپا ہو جائے گا
اپنوں سے حسد کرنے والا جل جل کے فنا ہو جائیگا
اک سیلِ جنوں بل کھائیگا، راحت کا علم لہرائے گا
تنگ آیا ہوا فاقوں سے وطن محلوں کو آگ دکھائے گا
ہر سمت اندھیرا چھائیگا، ہر سمت سے طوفاں اٹھیں گے

پُرہول تغیّر کے جھونکے انصاف بداماں اُٹھینگے
کوندے کی لپک، شعلوں کی دہک، تفسیر سیاست کردیگی
گُل اپنے چراغِ نخوت کو خود بڑھ کے امارت کردیگی
پتّوں کی نکیلی چھریوں سے گلچیں کا جگر کٹ جائے گا
ہر خار سے شعلے اُٹھینگے، ہر پھول لہو برسائے گا
تدبیر کے خونیں افسانے تقدیر کے لب دہرائیں گے
کھڑکی کو بگولے کھولینگے، سب صیدِ قفس اڑجائیں گے

غزل

ہر اک ذرّے سے ہے تابانیٔ شمس و قمر پیدا
ہر اک آئینے سے ہے صورتِ آئینہ گر پیدا

زمانہ بند کر دیتا ہے جس پہ اک درِ عشرت
تو اُس کے واسطے کرتی ہے فطرت لاکھ در پیدا

گداؤں کی نظر میں خاک ہے توقیرِ سلطانی
فسونِ عشق کر دیتا ہے ذرّوں میں نظر پیدا

نہیں کچھ دور یہ بھی سورما قوموں کی فطرت سے
شکستیں کھا کے بھی کر لیتے ہیں فتح و ظفر پیدا

جنوں کو چاہئیں بے خوف و عالی ظرف دیوانے
ہر اک دیوارِ زنداں کی ہو سکتے ہیں در پیدا

حقیقت بیں خزاں تعمیر ہے فصلِ بہاری کی
کہ دردِ سر سے ہوتی ہے دوائے دردِ سر پیدا

"ایک بار"

گیا ختمِ عاشقی کا فسانہ سناؤں میں
مضرابِ غم سے سازِ تمنّا بجاؤں میں
تارِ ربابِ آہ کو جنبش میں لاؤں میں
ناکامیوں سے اپنا مقدر سجاؤں میں
یہ کیا کہا کہ "اب ہمیں فرصت نہیں رہی"
رُکتے ہو کیوں کہو کہ محبّت نہیں رہی
مجھ اجنبی کو اپنا بنایا تھا کس لئے

یہ فرقِ رنگ و نسل مٹایا تھا کس لیئے
بن پوچھے دل کا راز بتایا تھا کس لیئے
انسان بنکے سامنے آیا تھا کس لیئے

کیا سب فریب تھا مرے غفلت شعار دوست؟
مجھ کو کسی کا بھی نہیں اب اعتبار دوست

اب ترکِ تم سے رسم و رہ خاص کیا کروں
غم کی ملی ہے عشق سے میراث کیا کروں
معدوم ہے نشاط تو احساس کیا کروں
قسمت میں یاس ہے تو بھلا آس کیا کروں

طائر خزاں میں بھی تو چمن چھوڑتے نہیں
حُبِ وطن کو اہلِ وطن چھوڑتے نہیں
تم کو خدا نے دی ہے ستاروں کی دلکشی

پھولوں کا رنگ روپ، بہاروں کی دلکشی
شامِ اودھ کے مست نظاروں کی دلکشی
گنگا کے خود تراش کناروں کی دلکشی

شاید ہوائے دہر نہ ہو پھر سے سازگار
ہاں ایک بار صرف یہ تکمیل ایک بار

غزل

خود کو خودی کا آئینہ دکھلا رہا ہوں میں
اپنا حریف آپ بنا جا رہا ہوں میں

قسمت کی پستیوں کی حدیں ختم ہو چکیں
اب رفعتوں کی سمت اڑا جا رہا ہوں میں

ناکامِ آرزو ہوں مگر اُف یقینِ عشق
دانستہ پھر فریبِ وفا کھا رہا ہوں میں

مُہرِ سکوت لب پہ ہے بہکے ہوئے قدم
اے بے خودی یہ آج کدھر جا رہا ہوں میں

پھر دیکھتا ہوں چہرۂ ماضی کے خدّ و خال
ساقی سنبھال ہوش میں پھر آ رہا ہوں میں

رُک جائے جسکے شور سے دہشت وجبل کی سانس
اس سیلِ رنج وغم میں بہا جا رہا ہوں میں

جانے کو ہوں احاطۂ عالم سے دُور تر
بس چند روز تم کو نظر آ رہا ہوں میں

شمس و قمر ہیں راہ میں ذرّات کی طرح
کس کی تجلّیوں میں گھِرا جا رہا ہوں میں

تھا جو خیال تیری جفاؤں سے بیش تر
دل کو اُسی خیال سے بہلا رہا ہوں میں

بڑھ بڑھ کے آج میرے قدم لے رہی ہے موت
کس زندگی کی سمت بڑھا جا رہا ہوں میں

انگڑائی

اِن فضاؤں کے میلے آنچل میں
ہے کوئی محو جلوہ آرائی
کہیں آبادیوں میں خاک اُڑی
کہیں ویرانوں میں بہار آئی

کہیں پھولوں نے آگ برسائی
وقت اک لے رہا ہے انگڑائی

کروٹیں لے رہی ہے راہگذار
راستے ہی میں کھو گئے راہی
اور کہیں چھاؤنیں سکوں پاکر
موت کی نیند سو گئے راہی

ہر طرف سے یہی صدا آئی
وقت اِک لے رہا ہے انگڑائی

ناخدا اِک بھنور میں گھوم گئے
ڈوبتے ہیں یہاں وہاں لاکھوں
ابھی طوفان اور آئیں گے
ابھی ڈوبیں گی کشتیاں لاکھوں

سطحِ دریا پہ لاش اُبھر آئی
وقت اِک لے رہا ہے انگڑائی

کیا خبر کل کی یہ کسے معلوم
تیری آہیں نہ مجھکو روک سکیں
تیرے آغوش سے نکل جاؤں
تیری باہیں نہ مجھکو روک سکیں

دیکھ بدلی سی چاند پر چھائی
وقت اِک لے رہا ہے انگڑائی

ہر طرف آہ کا دھواں اٹھّا
جانے کس کا سہاگ جلتا ہے
اشک بہہ بہہ کے پڑ چکے مدّھم
زندگی کا شباب ڈھلتا ہے

کس کی پھولوں کی سیج مُرجھائی
وقت اِک لے رہا ہے انگڑائی

رہگذاروں میں خون بہہ نکلا
ہنس پڑا تازہ زندگی کا اُفق
وقت ویرانیوں کی شہ پاکر
بن گیا ہے کسی خوشی کا اُفق

قصرِ ہستی سے اک صدا آئی
وقت اِک لے رہا ہے انگڑائی

تُند بجلی فلک پہ لہرائی
ایک لرزہ سا اک دھماکا سا

ہو گیا شق زمین کا سینہ
موت کا کھنچ رہا ہے خاکہ سا

جسمِ ہستی میں جھُرجھُری آئی
وقت اِک لے رہا ہے انگڑائی

غزل

نہ خزاں کا کوئی وجود ہے نہ چمن میں رنگِ بہار ہے
جسے جانتا ہے تو کارواں وہ تری نظر کا غبار ہے

نہ جمال میں ہیں لطافتیں، نہ لطافتوں میں ہے بیخودی
یہ جنونِ عشق کا بھوت ہے جو بشر کے سر پہ سوار ہے

مجھے بے نیازِ الم نہ کر، مجھے بے نصیبِ ستم نہ کر
مرے غم کی لذّتِ جاوداں، مری زندگی کی بہار ہے

یہ نہیں نشاط کا زمزمہ، اِسے گوشِ ہوش سے سُن ذرا
مرے سازِ دل کی صدا نہیں مری بے کسی کی پُکار ہے

مجھے زندگی کی دُعا نہ دے، مجھے ایسی سخت سزا نہ دے
مجھے دیکھ آ کے قریب تر مرا ہر نفس مجھے بار ہے

ہے بے خبر اسیر رہا ہوئے ہیں فروغ دورِ بہار میں
چلو ساؔ آج ہم بھی چلے چلیں کہ چمن میں عُرسِ بہار ہے

اُداس رات

سرد کیوں پڑ گئیں حسیں بانہیں
کیوں لبوں میں اُلجھ گئیں آہیں
اونگھنے لگ گئی چراغ کی لو
خواب آلود ہو چلیں راہیں
کچھ تو بولو بہت اداس ہوں میں

دیکھکر مجھکو سوگوار ہو تم
خشک آنکھوں سے اشکبار ہو تم
میں کہیں گم ہوں یادِ ماضی میں
اور ماضی کی یادگار ہو تم
آؤ باتیں کریں اُداس ہوں میں

زندگی تجھ کو بھی بکار آئے
ہر خوشی غم کے گھاٹ اُتار آئے

تیری محفل میں بے قرار گئے تیری محفل سے بے قرار آئے

آج کتنا اُداس اُداس ہوں میں

یادِ ماضی سے اُٹھ رہا ہے دھواں آگ ہے دل میں جل رہا ہے جہاں
منتظر روشنی کے ہیں آنسو آسماں بن گیا سیاہ کنواں

مجھ سے باتیں کرو اُداس ہوں میں

کھو چلا ہوں میں مجھکو سمجھاؤ آؤ میرے قریب آجاؤ
زندگی میں تھکن سی طاری ہے میری مایوسیوں کو بہلاؤ

مجھ سے پوچھو کہ کیوں اُداس ہوں میں

ذکرِ نیرنگیٔ حیات کرو ختم ہو جسطرح بھی رات کرو
ہے فضا کس قدر خموش خموش کوئی اپنی پرائی بات کرو

یہی کہہ دو بہت اُداس ہوں میں

غزل

بہت پچھتاؤ گے تم دردمندوں سے خفا ہو کر
کہ گل مُرجھا کے رہ جاتا ہے خاروں سے جدا ہو کر

کہاں جانا تھا مجھکو اور کہاں لاکر کیا رسوا
نگاہِ شوق نے دھوکا دیا ہے رہنما ہو کر

ستم کیجیے، جفا کیجیے، مگر انصاف سے کہیئے
یہ ناراضی بھلا زیبا ہے بندے سے خدا ہو کر

بہاریں جا رہی تھیں جب خزاں کیساتھ گلشن سے
گلوں کی آنکھ میں بھر آئے آنسو التجا ہو کر

زمانہ گر قیامت بھی اُٹھاتا ہے اُٹھانے دو
مگر اُٹھ کر نہ جاؤ میرے پہلو سے خفا ہو کر

خیالِ دوست خضرِ راہ ہے دشتِ محبّت میں
جنوں ہمراہ لے کر جا رہا ہے رہنما ہو کر

خدارا رحم کر پیمانِ الفت باندھنے والے
کہاں جاؤں گا میں آخر ترے غم سے رہا ہو کر

نہ بن جائے تمہاری زندگی کا آسرا کوئی
نہ اتراؤ کسی کی زندگی کا آسرا ہو کر

مجھے طوفان لے جاتا جہاں میرا مقدر تھا
ڈبویا ہے مری کشتی کو تم نے ناخدا ہو کر

ہماری دیکھا دیکھی تم وفاؤں پر نہ آ جانا
زمانے سے ہمیں کیا مل رہا ہے باوفا ہو کر

بیان کیا حالِ دل ہو جب محبت کا یہ عالم ہے
شکایت بھی مرے ہونٹوں پہ آتی ہے دعا ہو کر

عجب دستور ہے اے رآج دنیائے محبت کا
جفائیں سامنے آئیں وفاؤں کی سزا ہو کر

ستی

(قدیم معاشرت کی ایک تصویر سے متاثر ہو کر)

یہ تپش، ہر طرف جنگل کے سینے کی بھڑاس
پتیوں پر گرد اور شاخوں میں خم، سبزہ اداس
ذرّے ذرّے میں جہنّم کے جلے دل کا اثر
تیز جھونکے جس طرح سیّال امواجِ شرر
آتشیں کرنوں سے مرجھائی ہوئی رستوں کی گھاس
جس ایسا شہر میں ہنسی ہے چُپ، جنگل بن باس

یہ تپش کا زور، یہ شمشان بھومی کا سماں
کھنچ رہی ہے خود بخود تصویرِ انجامِ جہاں
خامشی ایسی کہ جنگل کی فضا گونجی ہوئی
کارِ ہستی میں شکستوں کی صدا گونجی ہوئی
اک جواں ارتھی کے ہیں چاروں طرف کچھ آدمی
جھک رہی ہے موت کے در پر جبینِ زندگی
باپ کے چہرے سے ہیں غم کے تاثر آشکار
بال بکھرائے ہوئے ہمشیر، اور ماں سوگوار
اک طرف بیوی کہ جیسے آندھیوں میں اِک دِیا
آملا ہو موت کے رستے سے جب اِک راستا
ظلمتِ غم کندنی چہرے پہ ہے چھائی ہوئی
سرخوشی کی لَو ہوائے غم سے تھرائی ہوئی

موت سے شوہر کی تنظیم سکوں زیر و زبر
دُھوپ کی تیزی کا جیسے لاجونتی پر اثر
ڈوبتی امید، مٹتی حسرتیں، بجھتا سہاگ
جیسے آسایں کبھی مل جائیں دیپک اور بہاگ
آنکھ حیرت کا مرقع، خشک لب، ساکت زبان
سنگِ لرزاں میں شرر لیتے ہوئے انگڑائیاں
وہ اُٹھی غمگین بیوہ، وہ بڑھی چہرے کی یاس
وہ محبت کی پجارن آگئی ارتھی کے پاس
جل کے مرنے کے ارادے سے تمنّا جی گئی
مُسکرائی اور کیسر کا پیالہ پی گئی
نیم وا آنکھوں کے در اور دِل کی دھڑکن تیز تر
رکھ لیا زانو پہ ہنس کر بے سکت شوہر کا سر

لکڑیاں چُن کر چِتا میں آگ دلوائی گئی
ساتھ ہی مُردے کے زندہ لاش جلوائی گئی

دو اشتراکِ غم کے دونوں کی نرالی شان ہے
جل رہی ہے ساتھ بیوی، ماں کھڑی حیران ہے

کہہ رہی ہے آگ کچھ فطرت عجب انساں کی ہے
یہ ہے بیوی کی محبّت، یہ محبّت ماں کی ہے

غزل

اب مری نگاہوں میں اوج ہے نہ پستی ہے
ایک سیلِ مدہوشی، اک ہجومِ مستی ہے

اے نگاہِ نامحرم! عشق کی وہ بستی ہے
جس قدر اجڑتی ہے اس قدر ہی بستی ہے

عاشقی و محبوبی آئینے کے دو رُخ ہیں
حُسن ایک بادہ ہے، عشق ایک مستی ہے

جذبۂ عبادت کو رکھ جزا سے بیگانہ
ورنہ حق پرستی بھی اک ہوس پرستی ہے

دل کی پائمالی کا غم تو کچھ نہیں لیکن
ایسی پُر فضا بستی مشکلوں سے بستی ہے

دیدہ ور کوئی دیکھے شانِ پیرِ میخانہ
اِس خودی کے چہرے سے بیخودی برستی ہے

ہمتوں کے بل اٹھّو، خود روی کے بل نکلو
لغزشوں کے بل چلنا ننگِ مے پرستی ہے

آدمی کے چہرے پر بندگی نہیں رہتی
ورنہ خود پرستی بھی اک خدا پرستی ہے

گیت

تو نے کبھی یہ سوچا سمجھا
ہم کس کارن دُکھ سہتے ہیں
ملنے روز چلے آتے ہیں
آ کر کیوں چپ چپ رہتے ہیں

اپنے پریم کے دو تارے تھے
اک اپنا تھا اور اک تیرا
جانے کونسا ٹوٹ گیا ہے
روتے روتے ہوا سویرا

چاہا بھی تجھ سی ناری کو
جسکی دُنیا دھن کی چھاؤں
جسکا سکھ من تن کا سکھ ہے
دھوپ برابر من کی چھاؤں

جانے ہم کیسے جیتے ہیں
پریم نہیں اک روگ ہے جی کا
تو کیا جانے حال ہمارا
اک سوگ ہے جی کا

پل دو پل کا سوگ نہیں ہے
جیون بھر کا سوگ ہے پیاری
ہم نے پریم کیا دُکھ پایا
سب اپنا سنجوگ ہے پیاری

غزل

ہنسنے کو تو ہنسا ہوں اکثر میں زندگی میں
لیکن یہ کون جانے کیا سوچتا ہوں جی میں

خودداریٔ محبّت اب کہہ رہی ہے مجھ سے
محبوبیت بھی شامل ہے حسنِ عاشقی میں

آتا نہیں تبسم ہونٹوں کے دائرے تک
یہ کیا پیام بھیجا تو نے مری ہنسی میں

اکثر سیاہ باطن ہیں بندۂ نمائش
ظلمت کا ہاتھ بھی ہے تاروں کی روشنی میں

کس کو بُرا بتا دوں، کس کو گلے لگا لوں

ہر شے حسین دیکھی دُنیائے سرخوشی میں

اے دشمنو بچا لو! اے دشمنو بچا لو

ناکام مر رہا ہوں آغوشِ دوستی میں

میری نظر میں یکساں ہیں دوست اور دشمن

اک خام دوستی میں اک خام دشمنی میں

مری سالگرہ

ہیں میری نگاہوں میں الم ریز فسانے

ماتم کو جگاتے ہیں یہ خوش لحن ترانے

ہر سانس کے مغموم ترنّم میں ہیں آہیں

اشکوں سے وضو کرتی ہیں معصوم نگاہیں

جذبات میں افسردگی! باتوں میں اُداسی

بوچھاڑ میں نغموں کی تمنائیں ہیں پیاسی

اللہ رے بدبختیٔ انساں کا قرینہ

غرقابِ الم ہے مری حسرت کا سفینہ

تدبیر بھی خاموش ہے تقدیر بھی چپ ہے

معمار بھی لب بستہ ہے تعمیر بھی چپ ہے

اللہ رے مجھ بندۂ ناکام کا عالم

آغازِ جوانی میں ہے انجام کا عالم

بگڑے ہوئے آثار ہیں، مغموم فضائیں

چلتی ہیں چمن میں مرے مسموم ہوائیں

اس عمر کی انیسویں گردش ہوئی پوری

شاید کہ ہے اب گردشِ افلاک ضروری

اے دردوالم! آج مری سالگرہ ہے

اے گریۂ غم! آج مری سالگرہ ہے

آ رقص میں آ ساز اٹھا حسرتِ خنداں
ہو جائیں اُداسی کی زمینیں طرب افشاں
اے یاس و الم چار طرف نور فشاں ہو
پھر سود مرا محوِ تماشائے زیاں ہو

یہ عمر ہے وہ جس میں کوئی غم نہیں ہوتا
اُمید کے دربار میں ماتم نہیں ہوتا
اس عمر کے رستے میں الم چل نہیں سکتا
قدرت کا کوئی عزم کبھی ٹل نہیں سکتا

لیکن یہ زمانے کی روش اور یہ بخشش
رنگِ رُخِ شادی سے ہے آلام کی بارش
یہ دوست ما یہ پیغامبرِ رنج و مصیبت

جن میں نہ وفا ہے نہ شجاعت نہ محبّت

یہ لوگ ہیں وہ جنکا پرکھنا بھی ہے دشوار

بن جائیں تو سونا ہیں بگڑ جائیں تو تلوار

یہ دشمنِ دیں چین سے جینے نہیں دیتے

چاکِ دلِ صد چاک بھی سینے نہیں دیتے

غزل

حبابِ الفت کی چاندنی میں مسرتوں کی کمی نہیں ہے

مگر مقدر کو کیا کروں میں نظر وہ پہلی جو تھی نہیں ہے

وہ ابتدا عشق کی تھی ہم کو گلہ تھا جب دردِ بے کسی کا

مگر شبابِ جنوں تو دیکھو شکایتِ بے رخی نہیں ہے

تری محبت ہے زہرِ شیریں، تری وفائیں حسین دھوکے

ہے لاکھ دشمن اگرچہ دُنیا، مگر یہ تجھ سے بری نہیں ہے

ہزار طوفاں سے عشق کھیلے، ہزار دل میں ہجومِ غم ہو
مگر فریبِ وفا جو کھائے وہ زندگی زندگی نہیں ہے

کمالِ عشق و وفا کے پرتو جہاں تہاں جگمگا رہے ہیں
یہ سب فریبِ نگاہ و دل ہے کسی میں کچھ دلکشی نہیں ہے

وہ اور ہونگے جو عیشِ دنیا کی آرزوؤں میں مر رہے ہیں
وہ چیز میں کیوں پسند کر لوں جو حاصلِ بندگی نہیں ہے

تری وفاؤں کے آسرے پر حدِّ تصوّر سے بڑھ گیا ہوں
مقام ایسا اب آگیا ہے تری کمی بھی کمی نہیں ہے

جوان ہے اب مری محبّت، شباب پر ہیں مری دعائیں
ہے موقعۂ خودکشی تو اے رازؔ ہمتِ خودکشی نہیں ہے

پرستارِ اشعار سے

روکتی کیوں ہے مجھے چھوڑ مجھے جانے دے

لہرکھاتی ہوئی زلفوں کی سیہ زنجیریں
میرے شانے میرے سینے سے لپٹ جائینگی
تیری نظروں کے ارادوں کی حسیں تصویریں
میرے احساس کے سانچے میں اتر آئینگی

خوفِ رسوائی سے باتیں جو ابھی راز میں ہیں
کبھی بے وقت مرے منہ سے نکل جائینگی

روکتی کیوں ہے مجھے چھوڑ مجھے جانے دے

تیری مخمور جوانی کے تلاطم کا بہاؤ
میری ہستی کے ارادوں میں نمو پائے گا

تیرے سینے کا یہ بیباک جواں سال اُبھار
کوہ بن کر مری منزل میں نظر آئے گا
تیرے آغوش کے حلقے میں مرا ذوقِ لطیف
اپنے آغاز کے انجام پہ شرمائے گا

روکتی کیوں ہے مجھے چھوڑ مجھے جانے دے

ایسا منہ زور ہوا جاتا ہے جرأت کا جنوں
منہ میں جو آتا ہے کہتا ہی چلا جاتا ہوں
زندگی آگ کا اور خون کا دھارا ہی سہی
بے جھجک میں اسی دھارے میں بہا جاتا ہوں
لیکن اس عشقِ دوروزہ کی گراں خوابی میں
رازِ تخلیق کے جادے سے ہٹا جاتا ہوں

روکتی کیوں ہے مجھے چھوڑ مجھے جانے دے

ابتدا عشق کی ہے ایک خیالی سا جنوں
گوش و آواز کا دھوکا ہے وفا کچھ بھی نہیں
عاشقی زہر ہے پینے کو پیا جاتا ہے
لیکن اکثر یہ سنا ہے کہ مزا کچھ بھی نہیں
میں ہوں جس منزلِ پُر پیچ میں تنہا و خراب
خضر تو خضر وہاں میرے سوا کچھ بھی نہیں

چند معصوم خیالوں کے نقوشِ سادہ
جن سے مرقوم و مرتب ہے کہانی تیری
تو ابھی واقفِ آدابِ زمانہ بھی نہیں
قابلِ رحم ہے یہ شوخ جوانی تیری
میں جوانوں کی محبّت کو سمجھتا ہوں ذلیل
کیوں ہے پھر مجھ سے یہ آشفتہ بیانی تیری

روکتی کیوں ہے مجھے چھوڑ مجھے جانے دے

تجھ کو کیا عشق کی منزل کے تقدّس کی خبر

تو جو ہے مائلِ آدابِ فریبِ اُلفت

جسکی فطرت ہو فریبوں کو مجسّم کرنا

کیا خبر اسکو غمِ عشق کی کیا ہے قیمت

اب مرے عشق کا انداز حریفانہ ہے

انتقامِ غمِ اُلفت ہیں کہاں ہے اُلفت

روکتی کیوں ہے مجھے چھوڑ مجھے جانے دے

بچ کے رہ تو ہی نہ زد پر مری آجائے کہیں

جا نکل جا مری تقدیرِ رسا سے بھی پرے

میرا ہر عزم ہے شب خونِ وفا کا ہمراز

اب اماں تجھکو ملے گی تو قضا سے بھی پرے

تجھ کو لازم ہے کہ تخلیق کرے اپنا جہاں
دُور اِس وادیِ تخلیقِ خُدا سے بھی پرے
روکتی کیوں ہے مجھے چھوڑ مجھے جانے دے

میری اِس شوخ بیانی سے ہے کیوں چیں بہ جبیں
جی میں جو آئے میں حاضر ہوں شکایت کر لے
ہاں ٹھہر جا کہ بتاتا ہوں تجھے راہِ جدید
ایک تسکین کا پہلو ہے جو زحمت کر لے
جب تجھے صرف محبّت مرے اشعار سے ہے
میرے اشعار سے پیمانِ محبّت کر لے
روکتی کیوں ہے مجھے چھوڑ مجھے جانے دے

غزل

گردش میں ہے زمین بھی کیا آسماں کے ساتھ
دُنیا بدل گئی نگہہ مہرباں کے ساتھ

دہرا نہ انجمن میں سمجھ سوچ کے اِسے
تیری بھی داستاں ہے مری داستاں کے ساتھ

اب میں ہُوں اور کُنجِ قفس کی مصیبتیں
وہ آشیاں کی بات گئی آشیاں کے ساتھ

بے تابیوں سے ربط تھا بے چینیوں سے کام
گزرے ہیں ایسے دن بھی اُس آرامِ جاں کے ساتھ

روزِ ازل وہی تو فقط مستحق نہ تھا
کچھ گردشیں ہمیں بھی ملیں آسماں کے ساتھ

غم کو ترے بُھلا نہ سکا دو جہاں کا غم
تیرا بھی غم رہا ہے غمِ دو جہاں کے ساتھ

اُمید ہی نہیں تو گزر جائے گی یونہی
اک مہرباں کے ساتھ کہ نامہرباں کے ساتھ

یہ سوز و سازِ عشق غمِ جاوداں سہی
دے عمرِ جاوداں بھی غمِ جاوداں کے ساتھ

منزل کا کیا یقیں ہو بتائے کوئی مجھے
جب رہگزار بھی ہے رواں کارواں کے ساتھ

زندگی

زندگی جیسے کسی مزدور کی نادار شام
غم کی دولت بھی گراں ہے اور خوشیاں بھی حرام
رات بھی تاریک ہے اور صبح بھی تاریک ہے
اک فسردہ نیند سی ہے بے نیازِ صبح و شام

حادثے ہی حادثے ہیں زندگی کے موڑ پر
کون جائے تجھ کو تیری خلوتوں کو چھوڑ کر؟

جانے والے چل ہی دیتے ہیں وطن کو چھوڑ کر
مست نظروں کے فسوں پرور سلاسل توڑ کر
اونگھتی کرنوں کی شمعیں ڈوبتے دل کا سہاگ
کاش جا سکتے نہ ہم دونوں کلا رشتہ جوڑ کر

ڈوب کر رہا ہوں میں تیری پھر اُبھر آیا ہوں میں
زندگی کے خارزاروں میں اُتر آیا ہوں میں

غزل

میرے ارمانوں کو پامالِ زیاں رہنے بھی دے
شوقِ منزل کو شریکِ کارواں رہنے بھی دے
وعدہ و پیمانِ الفت کو نہ دے لفظوں کا رنگ
درد سے لبریز نالوں کو جواں رہنے بھی دے
دیکھ مجھ کو حسرت آلودہ نگاہوں سے نہ دیکھ
یہ فسونِ شوخ اندازِ بیاں رہنے بھی دے

حائلِ الفت اگر ہے زندگی کی کشمکش
زندگی کی کشمکش کو درمیاں رہنے بھی دے

میں جہاں ہوں جس طرح ہوں، خوب ہوں دلشاد ہوں
حاصلِ الفت ہیں یہ بربادیاں رہنے بھی دے

وہ گزشتہ عیش و عشرت، وہ نشاطِ زندگی
خواب تھا، اس خواب کی رنگینیاں رہنے بھی دے

دوست، مجبورِ وفا ہو کر نہ کھا دل کا فریب
زندگی پر کامرانی کا گماں؟ رہنے بھی دے

نقشِ غم کو کیوں مٹاتی ہے دلِ غمگین سے
یہ مری خونیں بہاریں بے خزاں رہنے بھی دے

"شکست"

ایک بے نام سا بربادیِ ہستی کا غبار
تیرگی بن کے خیالوں میں مرے رقصاں ہے
کوئی صورت کوئی جلوہ نہیں مرغوبِ نظر
جانے کیا شے مرے سینے میں شرر افشاں ہے
زد پہ ہے گردشِ گردوں کی زمانے کا شباب
حُسن خاموش ہے اور عشق کا دل لرزاں ہے

سامنے کوئی نہیں چشمِ تمنائی کے
رُوح بے چین سی ہے عقل کی انگڑائی سے

اسی ماحول میں کہتی ہیں یہ کچھ تحریریں
ہم وہ پیغام ہیں اُترے ہیں جو سیاروں سے

تیری پلکوں سے یہ ٹپکے ہوئے اشکوں کے خطوط
اور ڈھلکتے ہوئے آنسو ترے رخساروں سے
یہ ترا سانگ توجہ کی طلب کرتا ہے
جس طرح گزرے طوائف کوئی بازاروں سے
لیکن اِن اشکوں میں رقصاں ہے یہ کِس کی تصویر
کس کا غم ہے یہ تری رُوح میں وجہِ تعزیر
چھپ کے نظروں میں تری ہنستا ہے کوئی مجھ پر
یہ کسی اور کی الفت کا ہے مجھ سے اقرار
کس کے عشرت کدۂ شب کا ہے مبہم سا سُراغ
تیرے اعضاء کی تھکن، تیری نگاہوں کا خمار
تیری تسکین ہے دھوکا ترے وعدے ہیں فریب
تیری ہستی ہے کسی اور کے غم سے سرشار

میری قسمت میں اگر منزلِ مقصود نہیں
وسعتِ دہر مرے واسطے محدود نہیں

کس کے بوسوں کی تجلّی ہے کہ رخشندہ ہیں
یہ ترے لب، ترے رخسار، تری پیشانی
کس کے سینے کے ہیں ہمراز یہ تیرے گیسو
کس نے محلوں میں بنایا تجھے اپنی رانی
کس کی صحبت کا اثر ہے تری طرزِ گفتار
یہ فریبوں کے ملمعوں کی جواں تابانی

جس کے غم میں تری حالت ہے دِگر میں تو نہیں
میرے منصب پہ کوئی ہو گا مگر میں تو نہیں

میں نے الفت کو تقدس کی ضیا سمجھا تھا
جس کی شاہد ہے ستاروں کی جوانی اتنبک

میں نے ہر حال میں ہر رنگ میں اُلفت کی ہے
جُوں کی تُوں ہے مرے اشکوں کی روانی اب تک
جس کو سمجھا تھا محبت، وہ تباہی تھی مری
میری تقدیر یہ کہتی ہے کہانی اب تک

اپنی اک پاک محبت کی نشانی ہوں میں
جو تباہی میں پلی ہے وہ جوانی ہوں میں

تیری تقدیس کا انجام شکستوں کی سزا
جس کو بچھڑے ہوئے مرکز پہ میں لا بھی نہ سکوں
تیری اُلفت، ترے عصیاں کی حریری سی نقاب
ایسی منزل ہے جہاں جاؤں تو جا بھی نہ سکوں
یاس و اُمید کے اُس جادۂ پُر پیچ پہ ہوں
خود کو پا بھی نہ سکوں، تجھ کو بھلا بھی نہ سکوں

بھول جاؤں میں تجھے یہ بھی کوئی دستور نہیں
حُسن مختار سہی، عشق بھی مجبور نہیں

غزل

فکر و خیال میں تمہیں لانے سے فائدہ
خود اپنے گھر میں آگ لگانے سے فائدہ

بیٹھے بٹھائے جی کو جلانے سے فائدہ
تعمیرِ زندگی کو مٹانے سے فائدہ

فریاد و آہ و نالہ و شیون فضول ہیں
شب کی خموشیوں کو جگانے سے فائدہ

پامال ہو چکے ہیں یہ اندازِ عاشقی
یوں سر کسی کے در پہ جھکانے سے فائدہ

اچھا نہیں ہے عشق میں خودداریوں کا خون
جو خود نہ آئے اُس کو بلانے سے فائدہ

عشق اور خیالِ طعنِ زمانہ غلط غلط
آخر بتاؤ ہم کو نہ ملنے سے فائدہ

اشکوں میں بہہ چکی ہے نگاہِ جمال جو
اب بے نقاب سامنے آنے سے فائدہ

گر جاوداں نہیں ہے محبت تو اے ندیم
یہ خوابِ زرنگار دکھانے سے فائدہ

بحرِ سکوں میں ڈوب گئی موجِ اضطراب
ساحل پہ غم کا سوگ منانے سے فائدہ

میں بے وفا ہوں تم ہو وفادار ہاں درست
اے راج اور بات بڑھانے سے فائدہ

کمالِ نظر

ہر اک قطرے کی گہرائی سے پیدا
سمندر کے سمندر دیکھتا ہوں

رگِ ہر گُل میں احساسِ نظر سے
سنان و تیغ و خنجر دیکھتا ہوں

محبت سے پرے بھی کوئی شے ہے
محبت سے گزر کر دیکھتا ہوں

مآلِ حُسن کے پردے میں اے راجؔ
اک عبرت خیز منظر دیکھتا ہوں

غزل

وقت آ گیا کہ حسنِ بہاراں سے کھیلئے
بوئے فریبِ رنگِ گلستاں سے کھیلئے

آسودگی ہی مقصدِ ہستی نہیں کوئی
پھولوں سے بچ کے خارِ بیاباں سے کھیلئے

انجام انفعال ہے اِس کا خدا گواہ
یوں کھیلنے کو غیرتِ انساں سے کھیلئے

غم کی گھٹاؤں سے ہے دھواں دھار زندگی
آنسو بہا کے گوشۂ داماں سے کھیلئے

تا چند لطفِ عہدِ گزشتہ کو روئیے
تا چند یادِ خوابِ گریزاں سے کھیلئے

گلباریوں میں لاکھ بہاریں خزاں ہوئیں
امسال میرے چاکِ گریباں سے کھیلئے

انجام ہر بہار کا جب ہے غمِ بہار
کس موسمِ بہار بداماں سے کھیلئے

بازیچۂ حیات میں جینے کے واسطے
مقصود کھیل ہے کسی عنواں سے کھیلئے

کشتی کو دے کے ساحلِ اُمید کا فریب
موجوں کو چھیڑئیے کبھی طوفاں سے کھیلئے

رقص و سرود و جام و صراحی کو چھوڑ کر
ہمت پڑے تو گردشِ دوراں سے کھیلئے

ہیں راجؔ چودھویں کی بہاریں شباب پر
اُس دلنواز دشمنِ ایماں سے کھیلئے

ایک رُخصت ہونے والی سے

میں مست ہوں میرا نشہ ذرا اُترنے دے
مجھے خدا کے لئے انتظار کرنے دے
میں اپنی آئی میں مرتا ہوں مجھکو مرنے دے
حیات خام نہ رہ جائے کچھ تو کرنے دے
نہ مجھ سے کہہ کہ "!! مجھے اب سے بھول جا پیارے
فلک پہ دیکھ وہ دو ٹوٹتے ہوئے تارے"

حسین چاندنی راتوں میں اشک بار نہ ہو
مری حیات کی مانند سوگوار نہ ہو
مری تباہی پہ اس درجہ بے قرار نہ ہو
کہیں یہ تیری محبت کا شاہکار نہ ہو

جوانِ وقت کو غم کی خموشیوں سے بچا
غرورِ حُسن کو نیم نگیوں کی زد پہ نہ لا

درست ہے کہ تغیّر کو ہے ثبات یہاں
ہر ایک ذرّہ ہے دھوکے کی کائنات یہاں
نہیں ہے محرمِ تقدیر دل کی بات یہاں
بہت ہے یہ بھی جو کٹ جائے ایک رات یہاں

نہ جانے صبح تجھے رنگ کیا دکھائے گی
نہ جانے تیرے لئے کیا پیام لائے گی

گناہ پاش اندھیرے کو جگمگائے جا
ہوس کی آنکھوں سے آنکھیں ابھی لڑائے جا
کسی کے کھوئے ہوئے گیت گنگنائے جا
ابھی ہے وقت ترے بس میں مسکرائے جا

تو اپنی سوچ، مرا کیا ہے میں تو جی لونگا
جو میرے سامنے آئے گا جام پی لوں گا

غزل

عشق کو کوئی نیا پہلو بدلنا چاہیئے
شوقِ دل آمادۂ خونِ تمنا چاہیئے

وہ تبسم ہو کہ گریہ تنہا تنہا کچھ نہیں
اشک بھی آنکھوں میں ہوں یوں مسکرانا چاہیئے

ترکِ دنیا سے کہیں ملتا ہے عقبیٰ کا سراغ
ہر نگاہِ شوق مجبورِ تماشا چاہیئے

سر میں سودا، تن میں جانِ ناتواں رکھتا ہوں میں
ہاں کسی جانب سے پھر آوازہ دے کیا چاہیئے

اہلِ دُنیا کو ملے دُنیا مجھے کیا اس سے کام
مجھ کو تم یعنی مجھے تو میری دُنیا چاہیئے

ہے بھروسا ایک خامی، ناز اک جرمِ عظیم
ہاں خدا پر ناز، بازو پر بھروسا چاہیئے

آرزوئے بزمِ عقبیٰ بھی ہے آخر آرزو
ترکِ دُنیا سے مقدم ترکِ عقبیٰ چاہیئے۔

راجؔ تابِ ضبطِ گریہ ہی نہیں تو کیا کروں
داستانِ غم سُنانے کو کلیجا چاہیئے

محبت

محبت ہے اک روحِ انساں کا راز
محبت سے ہے آدمی سرفراز
محبت نہ ہو زندگی کچھ نہیں
محبت نہ ہو آدمی کچھ نہیں
محبت سے پروازِ تخئیل ہے
محبت محبت کی تکمیل ہے
محبت نہ ہو روح روشن نہ ہو
محبت نہ ہو دل میں دھڑکن نہ ہو
محبت سے ہے زندگی کی نمود
محبت کا صدقہ جہاں کا وجود

محبت سے کھلتے ہیں فطرت کے راز
محبت مقاصد سے ہے بے نیاز
محبت سے ہے رُوح میں آب و تاب
محبت ہے خود آپ اپنا جواب
یہ مانا کہ لفظِ 'خدا' عام ہے
محبّت کا بگڑا ہوا نام ہے

غزل

مرغوب ہیں مجھے قفس و دام اندنوں
راس آرہی ہے گردشِ ایّام اندنوں
اِخفائے رازِ عشق پہ قابو نہیں رہا
ہر نالۂ خموش ہے پیغام اندنوں

راتوں کے خواب ٹوٹ کے آلام بن گئے
آتی ہے صبح لے کے غمِ شام اندنوں

اب دوستوں میں خوئے وفا نام کو نہیں
اپنوں کی دشمنی سے ہے آرام اندنوں

اے فطرتِ غیور مجھے غم کی بھیک دے
خالی ہے میرا کاسۂ آلام اندنوں

ساقی تری نظر کا اثر کون لے گیا
رندوں کے روبرو ہیں مئے و جام اندنوں

کن راستوں سے مجھ کو لئے جا رہا ہے شوق
منزل پکارتی ہے بہر گام اندنوں

شوق اب حلقۂ درِ جام و سبو سے گزر گیا
پیتا ہوں روز بادۂ بے جام اندنوں

اُن کے بغیر گھر کا یہ عالم ہوا ہے آج
آتے ہیں کاٹنے کو در و بام اندنوں

معراجِ خودی

اُمنگوں کو ارادے جگمگاتے ہیں ضیا ہو کر
مجھے اُمّید دکھلاتی ہے رستہ رہنما ہو کر

سفینہ کھے رہا ہوں میں تلاطم خیز طوفاں میں
ہیئے جاتا ہے مجھ کو شوق میرا ناخدا ہو کر

مرے سینے میں پل پل کر جواں ہوتی ہے خودداری
تکلّم رہ نہیں سکتا رہین التجا ہو کر

مری فطرت کو ننگِ بندگی سے سخت نفرت ہے
اُٹھوں گا اپنے معراجِ خودی سے میں خدا ہو کر

غزل

آج ہے ایثار کا جذبہ جو پروانوں کے پاس
تھی کبھی یہ دولتِ بیدار انسانوں کے پاس

عقل ہے اک آستیں کا سانپ فرزانوں کے پاس
بے خودی کتنی بڑی دولت ہے دیوانوں کے پاس

کس کی ہے دُنیا یہ، آخر صاحبِ خانہ ہے کون
میزباں دیکھا نہیں کوئی بھی مہمانوں کے پاس

عظمتِ دیوانگی کا شور فرزانوں میں ہے
ہے غنیمت یہ بھی رہ جائے جو دیوانوں کے پاس

شمع روشن ہو گئی آجاؤ جلنے کے لئے
یہ خبر جاتا ہے لیکر کون پروانوں کے پاس

گاہے آبادی کے سینے تک چلے آتے ہیں دشت
گاہے آبادی پہنچ جاتی ہے ویرانوں کے پاس

اشکِ حسرت، سوزِ غم، دردِ محبّت، داغِ دل
کیا نہیں سب کچھ ہے تیرے خستہ سامانوں کے پاس

تم نہ گر آتے تو کھنچ جاتے صنم خانے وہیں
تم نے خود توہین کی آکر صنم خانوں کے پاس

ناخُدا کشتی کے رُخ کو موڑ، لنگر کاٹ دے
مجھ کو ساحل سا نظر آتا ہے طوفانوں کے پاس

دیکھیں اب بیگانے کرتے ہیں اشارہ کس طرف
مجھ کو اپنوں نے تو پہنچایا ہے بیگانوں کے پاس

راحؔ جانے کس طرح کرتے ہیں سجدے برہمن
میں تو بن جاتا ہوں بُت جا کر صنم خانوں کے پاس

مت پوچھ

مجھ سے مت پوچھ کہ یہ ارضِ وطن ہے کہ نہیں
یہ خزاں دیدہ چمن زار چمن ہے کہ نہیں

بھوک اُگتی ہے بھرے کھیتوں کے دامانوں سے
پیاس اُٹھتی ہے مئے ناب کے پیمانوں سے
نغمے اُڑتے ہیں تو چیخوں میں بدل جاتے ہیں
قہقہے ضبط کی گرمی سے پگھل جاتے ہیں
غرقِ دریا ہیں مگر پیاس نہیں مٹ سکتی
یاس ہی یاس ہے اور یاس نہیں مٹ سکتی

جھلملاتے ہیں ہر اک آنکھ میں اشکوں کے چراغ
تُل کے بازاروں میں بکتے ہیں یہاں روح و دماغ

یہ کسان اور یہ مزدور، یہ گردش کے غلام
جن کا خوں کرتا ہے مرقوم کتابِ ایّام
صبحدم دن کی سپیدی کے غباروں کا طلسم
شام کو ڈوبتے سورج کی بہاروں کا طلسم
کوئی اِن فتنوں کو آواز نہیں دے سکتا
اِن کے ہاتھوں میں کوئی ساز نہیں دے سکتا
گرچہ چہرے پہ ہے ادبار کی صدیوں کا غبار
ان کی صورت سے جھلکتا ہے زمانے کا قرار
اِن پہ دُنیا کی عنایت کے ستم ہیں کہ نہیں
جھریاں، غم کے علامات قدم ہیں کہ نہیں
اِس حسیں رس بھرے گلزار میں سانپ اُگتے ہیں
صورتِ غنچہ چمن زار میں سانپ اُگتے ہیں

یہ بنی ترشی سجی سنوری حسیں تصویریں
یہ جلا یافتہ ظلمت کی مکیں تصویریں
حُسنِ بازار کی لذّات سے خائف۔ جیسے
ایک آلودۂ تہذیب طوائف جیسے
چُھپ کے کرتی ہے گنہ اوڑھ کے شب کا آنچل
دن کو چھپ جاتے ہیں عصیاں کے گھنیرے بادل
برف کے خون سے ترتیب ملائم بازو
گُدگُدے گول یہ مخمور جسم اکثر بازو
ڈگمگائی ہوئی سینے کی اُٹھانیں توبہ
سنگِ لرزاں کی لچکدار چٹانیں توبہ
چند سکّوں سے ہے سب گرمیِ بازار یہاں
اور اِس جنس کے لاکھوں ہیں خریدار یہاں

عمل آزاد نہیں عزم خداداد نہیں
جسم محمود گنہ، رُوح مگر شاد نہیں
زندگانی کے سفینے کو نہیں کھے سکتے
عظمتِ خفتہ کو آواز نہیں دے سکتے
برق جب سینۂ افلاک پہ لہراتی ہے
زندگی موت کے سینے سے لپٹ جاتی ہے
مجھ سے مت پُوچھ کہ یہ ارضِ وطن ہے کہ نہیں
یہ خزاں دیدہ چمن زار چمن ہے کہ نہیں

غزل

ساغرِ غم ہو کہ ہو جامِ دوامِ زندگی
مردِ میداں کے لئے ہے اہتمامِ زندگی

تابکے رسم و رواجِ عارضی پر اعتبار
جانبِ تکمیل چل اے ناتمامِ زندگی

زندگی کی پستیوں پر اکتفا ہرگز نہ کر
عرشِ اعظم سے بھی بالا ہے مقامِ زندگی

بخشتی ہے مسکرا کر موت جب جامِ سکوں
کانپتے ہاتھوں سے گر جاتا ہے جامِ زندگی

جس طرف لیجائے، لیجائے، جہاں جائے، چلے
چھوڑ دے اے راکبِ ہستی زمامِ زندگی

زندگی پائی تھی جب روزِ ازل انسان نے
موت تھی شاید شریکِ اہتمامِ زندگی

اے وفا نا آشنا مجھ کو نہ یوں پامال کر
احترامِ زندگی کر احترامِ زندگی

زندگانی سے جو اُکتائے کہاں جائے بشر
ذرّے ذرّے نے بچھا رکھا ہے دامِ زندگی

حُسن پر اپنے نہ ہو مغرور اے عشرت فروش
تجھ سے بالا ہے بہت میرا مقامِ زندگی

تیرا ملنا اور پھر مل کر جُدا ہونا نہ پُوچھ
ایک صبحِ زندگی ہے ایک شامِ زندگی

راجؔ نغمہ ہے مرا زندہ دماغوں کے لئے
مُردہ دل سمجھیں گے کیا میرا کلامِ زندگی

تاروں سے خطاب

اے دامنِ ظلمت میں چمکتے ہوئے تارو
خاموش تلاطم میں دمکتے ہوئے تارو

تم کتنے حسیں پھول ہو دامانِ فضا پر
میخانۂ تسکین ہو تم دوشِ ہوا پر

جب کشمکشِ دہر سے گھبراتا ہوں اکثر
دُنیا سے تو کیا خود سے بھی تنگ آتا ہوں اکثر

جب طائرِ تخئیل کو تسکیں نہیں ملتی
بے تاب اُمیدوں کی کلی جب نہیں کھلتی

میں عشق میں کھو کر بھی سکوں جب نہیں پاتا
ادراک کو گُم کر کے جنوں جب نہیں پاتا

ہوتا ہے یقیں مجھ کو کہ نایاب ہے دُنیا
دھوکوں کی نمائش ہے عجب خواب ہے دُنیا

اِس کشمکشِ دہر میں انبوہِ وغا میں
پاتا ہوں تمہیں اپنے تصوّر کی فضا میں

محسوس جو کرتا ہوں میں وہ کہہ نہیں سکتا
تسکین سے دل لاکھ رہے رہ نہیں سکتا

ڈرتا ہوں مگر تم بھی مجھے چھوڑ نہ جاؤ
نازک دلِ شاعر ہے کہیں توڑ نہ جاؤ

تم پیکرِ تسکین و وفا ہو یہ بجا ہے
سجدہ بھی تمہیں عشق کے ایما سے روا ہے

مانا کہ الگ رہتے ہو تم بزمِ جہاں سے
بالا ہو بہت کشمکشِ سود و زیاں سے

نادم ہوں کہ میں تم میں ابھی کھو نہیں سکتا
بیگانۂ احساس کبھی ہو نہیں سکتا

بربادیٔ تقدیر کی ہوں زندہ کہانی
انجام کے قدموں پہ ہے آغازِ جوانی

دیکھے ہیں بہت صاحبِ اخلاص و مروّت
ہر بات پہ کرتے تھے کبھی دعوئے الفت

اُن کی وہ ضیاریز نگاہیں وہ اشارے
وہ رات کی باتیں وہ سکوں بخش نظارے

ہاں اُن کے تبسم میں وہ ڈھلتے ہوئے تارے
رہ رہ کے وہ کروٹ سی بدلتے ہوئے تارے

آنکھوں کے اشاروں سے چھلکتے ہوئے منتر
بہکی ہوئی محفل میں کھنکتا ہوا ساغر

یوں ہی طرب افزا یہ پری خانے رہیں گے
میرے لئے بیگانے ہیں بیگانے رہیں گے

چلنے کی ابھی تاب ہے اور راہ نہیں ہے
اک درد سا دل میں ہے مگر آہ نہیں ہے

گرتے ہوئے تدبیر کی تعمیر کو دیکھا
تقدیر کو دیکھا ارے تقدیر کو دیکھا

شکوہ نہیں بربادیٔ ایمان کا مجھکو
شکوہ نہیں کم ظرفیٔ انسان کا مجھکو

یہ ننگِ بشر ننگِ جہاں، ننگِ وفا ہیں
یہ شہر کے انسان درندوں سے سوا ہیں

ڈرتا ہوں نہ تم میرے تصور سے نکل جاؤ
ہم رنگِ زمانہ کہیں کروٹ نہ بدل جاؤ

غزل

مرے سکون کی دنیا میں اضطرار نہیں
نہیں نہیں مجھے اب تیرا انتظار نہیں

وہ بے وفائی کے قائل ہیں جاں نثاری کا
کسی کو اپنی طبیعت پہ اختیار نہیں

سمجھ سکے کوئی کیا میرے ظرفِ عالی کو
پیئے ہیں میکدے لیکن ذرا خمار نہیں

تری نگاہ سے گر کر یقیں ہوا مجھکو
جہاں میں کوئی کسی کا بھی غمگسار نہیں

مرے خفیف تبسم پہ بھولنے والو
میں کامگار نہیں ہوں میں کامگار نہیں

ہیں دل سے ترکِ محبت کے مشورے لیکن
تمہیں بھلا بھی سکوں گا یہ اعتبار نہیں
معاملے میں محبت کے بدگمان ہوں آج
وہ کیا ہیں مجھ کو خدا کا بھی اعتبار نہیں

دوزخ

میری تقدیر کے تابندہ ستاروں کی نہ پوچھ
ابھی نوخیز محبت ہے بہاروں کی نہ پوچھ
آج تخریب سے تعمیر کی بنیاد اُٹھی
آج تقدیر سے تدبیر کی بنیاد اُٹھی
جس کا حاصل ہے محبت وہ نظر جاگی ہے
شبِ اندوہ کی ظلمت میں سحر جاگی ہے

دل کی وادی میں کچھ اس رنگ سے جھلکا ہے شباب
جس طرح شب کو نکل آئے یکایک مہتاب

جیسے رہرو کوئی بھولا ہوا کہساروں میں
پہروں آوارہ رہے فکر کے گہواروں میں

خود ہی پھر سامنے آجائے وہ میدانِ مآل
جس کی اُمید کی تعمیر ہو ایوانِ خیال

ہر نفس پردۂ دُوری کو اُٹھاتا جائے
غمِ انجام نگاہوں سے گراتا جائے

باہوں میں باہیں لئے ساتھ چلا جاتا ہوں
جذبۂ شوق سے معمور بڑھا جاتا ہوں

جس جگہ رات کے افسوں کا اثر ٹوٹے گا
دُور ہاں دُور جہاں رنگِ شفق پھوٹے گا

اسی وادی میں ہے سوئی ہوئی منزل میری
رُوحِ فردوس میں کھوئی ہوئی منزل میری
راستہ خود ہی محبت کا بنا جاتا ہے
فرشِ پگھلے ہوئے تاروں کا بچھا جاتا ہے

کیا کہوں کیسا بھیانک تھا وہ ظالم منظر
تھا میں اک زندگی و موت کے دوراہے پر
وقت کے کانپتے ہاتھوں نے جھنجوڑا ہم کو
اور اِک دوسرے سے اس طرح توڑا ہم کو
جس طرح صبح حسیں خواب کو لے جاتی ہے
اور اک مغرب روپوش میں دفناتی ہے
لاکھ چاہا کہ میں تغیّر کو بڑھ کے روکوں

لڑکھڑاتی ہوئی تقدیر کو بڑھکر روکوں

ہر طرف ایک اندھیرا سا نظر آتا تھا
شب عشرت کا سویرا سا نظر آتا تھا

روح آمادۂ پرواز تھی تن سے میرے
زندگی روٹھتی جاتی تھی بدن سے میرے

لاکھ چاہا کہ میں رک جاؤں مگر رک نہ سکا
دل پہ ہوتا ہے جو آفت کا اثر رک نہ سکا

اور اب دور بہت دور نکل آیا ہوں
وہ رہِ دشت، آہ وہ جادہ ہی بدل آیا ہوں

اب میں اس خوابِ مسرت کو بھلا بیٹھا ہوں
ہاتھ تسکین و محبت سے اٹھا بیٹھا ہوں

کیف سے خواب بھی محروم رہیں گے برسوں

میں ہی کیا وہ بھی تو مغموم رہیں گے برسوں

مجھ کو یہ شدتِ احساس فنا کر دے گی

زندگی خود مجھے جینے سے خفا کر دے گی

کیا کہوں کشمکشِ عشق کو کیا سمجھا ہوں

ایک تقدیسِ محبت کی سزا سمجھا ہوں

غزل

خوگرِ غم جو مریضِ تپِ ہجراں ہو جائے

ہر نظر ایک حدیثِ غمِ پنہاں ہو جائے

عشق اندازِ ازل سے جو نمایاں ہو جائے

حسنِ مغرور چراغِ تہہِ داماں ہو جائے

منکشف تجھ پہ اگر عظمتِ عصیاں ہو جائے
پردے اُٹھتے وہ نظر آئیں کہ حیراں ہو جائے

میں نے تفریق کے آئین و قواعد کے خلاف
کُفر کو ایسے سجایا ہے کہ ایماں ہو جائے

تیری ہر بات زباں تک ہے، وگرنہ اے دوست
جس کی تسکین کرے تو وہ پریشاں ہو جائے؟

اے سکوتِ غم و اندوہ مزا تو جب ہے
میرا غم دوست کے چہرے سے نمایاں ہو جائے

تلخیِ ہجر سے ہر سانس ہے بیزارِ حیات
موت آئے تو مری زیست کا ساماں ہو جائے

عشقِ گستاخ کی غیرت کو کہاں موت آئی
ہائے وہ اور جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

اب ترے غم کی بھی لازم ہے حفاظت اے دوست
کہیں یہ بھی نہ شکارِ غمِ دوراں ہو جائے

منقسم دہر میں ہے جو مرے حصّے سے الگ
کاش وہ غم بھی شریکِ غمِ دوراں ہو جائے

کیسا نازاں ہے چمن آمدِ فصلِ گُل پر
اپنی تشریح جو حُسن لے تو بیاباں ہو جائے

فیض یہ جوشِ جنوں کا ہے کہ اللہ اللہ
تیرا دامن بھی پکڑ لوں تو گریباں ہو جائے

لُطف تو جب ہے کہ اے سجدہ نثارانِ حرم
حُسن سجدوں کا جبینوں سے نمایاں ہو جائے

برہمن سے آج کوئی مجھ سا مشکل ہو گا
جس کو دوں کُفر کی تعلیم مسلماں ہو جائے

خلوتِ مصروف

سکونِ دل ہے اسی آرزو سے زیر و زبر
ترے لبوں پہ ہوں میرے لبوں کے پیمانے
زبانِ شل پہ ہوں بے ربط کانپتے فقرے
نظر میں چونکتے احساس کے ہوں افسانے

ربابِ وقت جوانی کے گیت دہرائے
نوازشوں میں محبت کا لوچ آجائے

ترے گداز بدن کو جو گھیر لے آغوش
فشار سے ترا اٹھتا شباب گھبرائے
کشاکشوں میں ترے دل کی تیز رو دھڑکن
وفا کے گرم تنفس میں جذب ہو جائے

ہوں میرے شانے تری زرم ورِیشمیں زلفیں
جو کھیل کھیل چکے ہیں وہ کھیل پھر کھیلیں

یہ خواب خواب رہیں گے یہ خواب خواب رہے
کسی طرح یہ حقیقت میں ڈھل نہیں سکتے؟
مقدروں نے انہیں دی ہے اس طرح ترتیب
عمل کی راہ میں یہ خواب چل نہیں سکتے
کہ گردِ راہ کبھی کارواں نہیں ہوتی
بلند ہو کے زمیں آسماں نہیں ہوتی

خیال میں ہے وہ ماضی کا آسماں لیکن
رفیق دہر دستارے ہیں چاندنی ہی نہیں
ہر ایک شے مجھے دُھندلی دکھائی دیتی ہے
کہ جیسے اب مری آنکھوں میں روشنی ہی نہیں

یہ کیا ہے ربطِ محبت، یہ عاشقی کیا ہے؟
یہ کائنات ہے کیا شے یہ دل لگی کیا ہے؟

مجھے بتائے خدارا مجھے بتائے کوئی
عجیب بات ہے آغاز بن گیا انجام
کہ جس طرح سے مصائب میں خستہ حال کوئی
غروبِ مہر سے پہلے ہی گھر میں دیکھے شام
سحر کو کیوں نہ پکارے کہ شام آئی ہے
سیہ دبیز گھٹا حسرتوں کی چھائی ہے

سحر کی طرح درخشاں نہ کیوں کروں اشعار
تخیلات کے تاروں کو کیوں نہ چمکا دوں
نجوم و ماہِ محبت کی چاندنی لیکر
ہر ایک ذرے کے دامن پہ نور برسا دوں

فسونِ شعر کی تکمیل ہو تو بہتر ہے
وفورِ شوق کی تعمیل ہو تو بہتر ہے

کمالِ فن ہی پہ جھکتا ہے حسنِ سرافراز
وگرنہ عشق کا جادو جھکا نہیں سکتا
ہوا نصیب جسے باکمال کا آغوش
زمانہ پھر اسے آوارہ پا نہیں سکتا

فسونِ شعر سے عالم پہ فتح پاؤں گا
کسی کے حسن سے تنہائیاں بساؤں گا

تو مجھ کو دیکھے گی عصمت کی پست وادی سے
میں اپنے فن کی بلندی پہ گیت گاؤں گا
مزار ہوں گے ترے دل میں تیری عشرت کے
میں کامرانیِ مقصد پہ مسکراؤں گا

تو اپنی روح کی آلودگی پہ روئے گی
تری جوانی بڑھاپے کی نیند سوئے گی

مرے اِن اشکوں سے برسیں گے قہقہوں کے گلاب
جو شکلِ خار ترے دل میں پھوٹ آئیں گے
قسم مجھے ترے اِن گرم قہقہوں کی قسم
یہ قہقہے ترے اشکوں میں ڈوب جائیں گے
میں اپنے عزم کے جوہر تجھے دکھاؤں گا
میں مسکراؤں گا اک روز مسکراؤں گا

غزل

بدلا ہوا ہے رنگِ گلستاں مرے لئے
خوں رو رہی ہے چشمِ بہاراں مرے لئے

فیضِ جنونِ شوق کے قربان جائیے
وسعت ہے دو جہان کی زنداں مرے لئے

سب اہلِ دل ہیں تیری نگاہوں سے فیضیاب
اب تو کہاں ہے صرف مری جاں مرے لئے

میں خود ہی چھوڑ جاؤں گا یہ محفلِ حیات
کیوں ہو رہے ہو اتنے پریشاں مرے لئے

وہ زندگی جسے تری محفل میں بار تھا
اب ہو گئی ہے خوابِ گریزاں مرے لئے

اے مرے چاک گریباں سے بے خبر
تو بھی بکھر رہے گا چاک گریباں مرے لئے
پھولوں کے نازِ اہلِ چمن کو رہیں نصیب
خنداں ہیں خارہائے بیاباں مرے لئے

ایک شاعرہ سے

اے ہوس مشرب و رندانہ، اے گنہ کی راز داں
دشمنِ تقدیس، اے داغِ دامنِ ہندوستاں
شرم آنکھوں میں نہیں دل میں ترے غیرت نہیں
آہ تو عورت نہیں۔ عورت نہیں، عورت نہیں

کیوں تجھے اس اپنے اندازِ سخن پہ ناز ہے
وہم یہ کیوں ہے کہ تیری ہر صدا اعجاز ہے
تو سمجھتی ہے کہ عالم تیری بزمِ ناز ہے
سانس ہر انسان کی تحسین کی آواز ہے
تو سمجھتی ہے کہ تو ہے رہنما اس دور میں
وقت کی آواز سے ہے آشنا اس دور میں
دیکھ اے تصویرِ عصیاں، اے پرستارِ گناہ
تیرا چہرہ سر بسر ہے آئینہ دارِ گناہ
تیرے ہونٹوں پر تبسم میں شرارت کی جھلک
تیرے سینے پہ گناہوں کی تمازت کی جھلک
ہر ادا ایماں بہ کف، ہر نظر عصیاں بہ دوش
سانس میں سیرت کی بھول میں نکو کاری خموش

لیڈری کے بھیس میں عصمت فروشی کی دُکاں
آتشِ عصیاں سے دِن بوڑھے مگر راتیں جواں
جال پھیلائے ہیں تو نے تازہ جانوں کے لیے
تیرے نغموں میں ہے دھوکا نوجوانوں کے لیے
بے حیائی تک یہ بے باکی تجھے زیبا نہیں
تو ہے عورت ایسی ناپاکی تجھے زیبا نہیں
پستیِ اخلاق کوئی، جوہرِ انساں نہیں
بے حیا! یہ بے حیائی شیوۂ نسواں نہیں
ہے تری سیرت کا گلدستہ گنہ کی دھوپ میں
تو ہے اک سیلابِ عصیاں آدمی کے روپ میں
ہیں ہوس کی لُو سے تیری چادرِ عصمت میں داغ
تیری صبحیں دے رہی ہیں تیری راتوں کا سراغ

حیف تجھ میں غیرتِ نسوانیت مفقود ہے
تو نجس ہے تیرا ہر پہلو ہوس آلود ہے
جسم پر مت دیکھ ان رنگین کپڑوں کی پھبن
آئینہ ہے تیرے کیرکٹر کا اوچھا بانکپن
تو نے عفت بیچ ڈالی شاعری کی آڑ میں
دھجیاں ہیں تیری عصمت کی گنہ کی باڑ میں
ایسے گانے کو کمالِ شاعری کہتے نہیں
دل کی ظلمت کو جمالِ شاعری کہتے نہیں
یہ تو مانا تو ہوس کے واسطے تسکین ہے
تیری ہستی شعر و نغمہ کے لئے توہین ہے
دامنِ انسانیت پر تو ہے اک داغِ سیاہ
لیکن اے تیرہ نظر، اے کشتۂ کیفِ گناہ

وقت ہے اب بھی سنبھل ہوش و خرد سے کام لے!
اپنی یہ گرتی ہوئی تعمیرِ عصمت تھام لے!

غزل

ذرہ ذرہ دُنیا کا بے قرارِ ہستی ہے
آدمی کو جانے کیوں اعتبارِ ہستی ہے

آجکل مری ہستی سوگوارِ ہستی ہے
اختیار سے باہر اختیارِ ہستی ہے

اے مسافرِ ہستی چاہے جس طرف چل دے
شش جہاتِ دو عالم رہگزارِ ہستی ہے

شاہراہِ الفت میں غم نہ کر تباہی کا
نامرادِ ہستی ہی کامگارِ ہستی ہے

شرمگیں نگاہوں کو مجھ سے پھیر کر مت جا
تیرے اک تبسم پر انحصارِ ہستی ہے
عشق و غم کی اصلیت کچھ نہیں بجز اس کے
اِک خمارِ مستی ہے اِک خمارِ ہستی ہے
دوست کا تصور ہے نو بہ نو فضاؤں میں
آج میرا ہر مصرع شاہکارِ ہستی ہے

انجام

جانتا ہوں خواب رنگیں ہے حیاتِ بے ثبات
موت کے پردے میں پنہاں زندگی ہو جائے گی
رات کی چھاؤں میں سمجھاتا ہے مجھکو ماہتاب
چاندنی حد سے گزر کر تیرگی ہو جائے گی

ہے خودی بھی اک بڑی شے لیکن اس کا کیا علاج
ارتقا کی زد میں آ کر بے خودی ہو جائے گی

عقل کے آئینے میں صاف آتا ہے نظر
ایک دن فرزانگی دیوانگی ہو جائے گی

کاش ہوتی مجھکو آغازِ محبت میں خبر
ہوتے ہوتے دل لگی دل کی لگی ہو جائے گی

اب تو میں جس سے بھی ملتا ہوں یہ ہوتا ہے خیال
یہ محبت کی حضوری بے رخی ہو جائے گی

راہِ آج یہ وقت تعارف دل سے آتی ہے صدا
دوستی آخر کو اک دن دشمنی ہو جائے گی

غزل

عشق کے یہ بے صبر تقاضے، حُسن کے یہ کمزور بہانے
اِن میں سکونِ روح کہاں ہے یہ بھی فسانے وہ بھی فسانے

اُف رے مقدر تیرے کرشمے، ہائے محبت تیرے زمانے
دِل کی دُکھن، اشکوں کی روانی، کوئی نہ سمجھے کوئی نہ جانے

حُسن ہی تنہا حسن نہیں ہے، عشق کا بھی اک عہدِ حسیں ہے
آگے اب تقدیر کی باتیں سمجھے نہ سمجھے جانے نہ جانے

عجزِ محبت اللہ اللہ، زعمِ خدائی توبہ توبہ
عشق کی ضد بھی عشق کی ضد تھی وہ تو مصر تھے ہم ہی نہ مانے

دُکھ کی اِس چڑھتی ندی میں موجوں سے میں کھیل رہا ہوں
فانی دُنیا ہنستی کیوں ہے تو ابدی عشرت کیا جانے؟

عشق بھی تنہا حُسن بھی تنہا غافل کھویا کھویا
کون وفا کا سونا پرکھے، کون جفا کا رتبہ جانے

جا کے جنابِ خضر سے کہہ دو راہنمائی باطل باطل
جب میدانِ جنوں آ پہنچا، اب آئے ہیں راہ دکھانے

رات کا جب دم ٹوٹ رہا تھا سب کی نگاہیں سوئے فلک تھیں
ہم نے یہ اپنی آنکھوں سے دیکھا شمع بنے جل کر پروانے

حُسن کا چہرا اُترا اُترا عشق کی آنکھیں پھیکی پھیکی
بد رنگی سی بد رنگی ہے لوگ نئے، ایمان پُرانے

غم میں زبان بھی سل جاتی ہے، اشک بھی اُلٹے پھر جاتے ہیں
لیکن اے دل بات تو جب ہے عشق کو خود حُسن آئے منانے

عشق کا چہرا خنداں خنداں، حُسن کی دُنیا حیراں حیراں
کیسے معمے بوجھ رہا ہے راج کی باتیں راج ہی جانے

صیدِ ہوس

قصرِ ہستی میں گونج اٹھتی ہے
چیختی عورتوں کی یہ آواز
"بے وفا مرد، بے وفا ہے مرد"
اک یہ مفہوم اور لاکھوں ساز

خود فریبی کے کھیل کھیلتے ہیں
کیسے اپنی ہوس کے صیدِ نحیف
اشک آنکھوں میں پھیل جاتے ہیں
ہونٹ آلودِ زہر خندِ لطیف

چشمِ یاس آفریں کے دامن میں
سوئی تصویریں چونک اٹھتی ہیں
یادِ ماضی سے خون رِستا ہے
سُرخ شمشیریں چونک اُٹھتی ہیں

خواب آلود سے دُھندلکوں میں
ایک پھولوں کی سیج ہنستی ہے
جس کی ہر ہر کلی کے ہونٹوں سے
پریم کی راگنی برستی ہے

رات خود راستہ دکھاتی تھی
بن کے پھولوں کی رانی تو آئی

اپنے آنچل کو بل پہ بل دیتی
اپنی سج دھج پہ خود ہی شرماتی

تیری دوشیزگی کی نظروں میں
بے قراری کے زندہ افسانے
ریشمیں گال اور پیشانی
بولتی چاندنی کے پیمانے

نرم پُروا کا ایک ایک جھونکا
چھیڑتا تھا اُبھارتا تھا مجھے
تیری سلگی ہوئی نگاہوں میں
تیرا جوبن پکارتا تھا مجھے

تیری عرصے کی جستجو کے نثار
جستجو کا ثمر دیا میں نے
اپنے فردا کی نرم کلیوں سے
تیری جھولی کو بھر دیا میں نے

روح سے روح اور ہونٹ سے ہونٹ
ہو گئے ایک آج پریم کے میت
دھڑکنیں دل کی گونج گونج اٹھیں
ہو گیا ایک تیرا میرا گیت

مانگ کی کہکشاں میں خونِ جگر
لے کے سیندور بھر دیا میں نے

تو نے جو چاہا ملگیا تجھکو
رات کو یوں سحر کیا میں نے

دِل دھڑکتا ہوا ستارا اٹھا
صبح کے سانولے سے ماتھے پر
تیری نظروں کی ایک آہٹ پر
تیرے ماتھے پہ رکھدیا لاکر

تو سہاگن بنی اور میں تیرا سہاگ
صبح کی دیوی مسکرا اٹھی
نور کی مرمریں شعاعوں سے
یک بیک دُنیا جگمگا اُٹھی

اپنا آنچل چھڑا کے تو مجھ سے
کھو گئی اُس نئے اُجالے میں
نظریں مایوس ہو کے لوٹ آئیں
ایک بے مُورتی شوالے میں

میں وہ اک بے گناہ سا فنکار
اپنی ایجاد پر جو برہم ہو
جیسے دُنیا کو دیکھ کر یزداں
اپنی کاوش پہ خود پشیماں ہو

رات آتی ہے اب بھی آتی ہے
کہکشاں خون سا اُگلتی ہے

صبح کے کانپتے ستارے ہیں

زندگی کروٹیں بدلتی ہے

عورتیں بے وفا و آوارہ

اپنی صبحِ ہوس پہ ہیں خنداں

ہر نئے باغ کی بہاروں سے

مانگتی ہیں سہاگ کی کلیاں

خود فریبی کے کھیل کھیلتے ہیں

کیسے اپنی ہوس کے صیدِ لطیف

اشک آنکھوں میں پھیل جاتے ہیں

ہونٹ آلودِ زہرِ خندِ لطیف

میری دنیا کو کر دیا شعلے
لے کے مجھ ہی سے سرخ آگ کی بھیک
رات کے کاسۂ گدائی میں
مانگنے آئی تھی سہاگ کی بھیک

غزل

زندگی ہے عشق میری روح خودداری مری
وائے مجبوری مری ، صد حیف مختاری مری

گرچہ تم ہو حاصلِ ہستی مگر اے جانِ زیست
دولتِ دیدار سے بڑھ کر ہے ناداری مری

تم کو نظروں سے بمجبوری گرا سکتا تو ہوں

جانے پھر کیا رنگ دکھلائے یہ مختاری مری

عشق نے کر دی ہے مجھ پر قیمتِ دل آشکار

کیا جھکے گی اب تمہارے در پہ خودداری مری

ذرّہ ذرّہ نا شناس لیت مجھکو آتا ہے نظر

میری ہستی تلخ کر دے گی یہ بیداری مری

ترقی پر جو دیکھی دوستوں کی بے رُخی ہم نے

ترے قدموں میں لا کر ڈال دی ہے زندگی ہم نے

بہت ڈھونڈھا نہ پایا آدمی کو آدمی ہم نے

ترے بندے اتری مغرور دُنیا دیکھ لی ہم نے

ہمارا عشق گو ناکام کا ناکام ہے لیکن

ہمیں وادِ جنوں دے لاج رکھ لی ہے تری ہم نے

چلے تو تھے حقیقت کی طرف پردے ہٹانے کو
نتیجہ یہ ہوا اپنی حقیقت کھول دی ہم نے

بسا اوقات آغوشِ نظر میں تیرے ہوتے بھی
نہ جانے کس لئے تیری کمی محسوس کی ہم نے

ہجومِ علم کے باوصف انساں طفلِ مکتب ہے
سمجھ کر سوچ کر توڑا ہے جامِ آگہی ہم نے

کئی جلوے چمک اُٹھے، کئی راہیں نکل آئیں
زمانے پر ابھی کی تھی نگاہِ سرسری ہم نے

صدائے بازگشت آئی نہ ایوانِ تغافل سے
حدودِ عشق سے بڑھ کر بھی گو آواز دی ہم نے

لہو کے آنسوؤں سے داد دی آہ آج شبنم کو
چمن میں مسکراتی جب کوئی دیکھی کلی ہم نے

رنج ابتدا کا کہ نہ غمِ انتہا اُٹھا
جس سمت اُٹھا نگاہِ طربِ تمنا اُٹھا

دیدار کفر ہے نہ محبت گناہ ہے
چہرہ ذرا سی بات پہ کیوں تمتما اُٹھا

سرگوشیوں میں آج یہ کیا کہہ گئے ہو تم
محفل میں ایک حشرِ سکوں بار ہا اُٹھا

تم کیا خفا ہوئے مری قسمت خفا ہوئی
تم مسکرا دیئے تو جہاں مسکرا اُٹھا

مہتاب آب آب ہے تارے عرق عرق
اے نامراد وقت ہے دستِ دعا اُٹھا

اک نقطۂ نگاہ کی تکمیل فرض ہے
کس نے کہا ہے تجھ کو غمِ ماسوا اُٹھا

ہوتا ہے کیوں حقیقتِ ارض و سما میں گم
کیفیتِ مناظرِ ارض و سما اُٹھا

بازارِ حسن میں کوئی اہلِ نظر نہیں
مت پوچھ میری جنسِ محبت کا کیا اُٹھا

یوں دادِ وعدہ دی مرے غفلت شعار نے
کچھ کہہ کے مجھ غریب سے خود مسکرا اُٹھا

اِس حال میں بھی پاسِ محبت غلط ہے آج
اے خود فریب آج بساطِ وفا اُٹھا

منظر و پسِ منظر

اِک نظر دیکھ اِدھر راہرو راہِ حیات
تجھ سے اخلاص و مروّت کی تمنا بھی نہیں

میری پلکوں میں یہ اُلجھے ہوئے تاریک آنسو
جن کے بہنے کا نہ بہنے کا بھروسا بھی نہیں

دیکھ اِس روندی ہوئی خاک پہ قدموں کے نقوش
کبھی اِس راہ سے عصمت، کبھی عظمت گزری
لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں — راہی ٹھہرے
میں کھڑا ہوں اسی دوراہے پہ مدّت گزری

مجھ کو بخشی ہے زمانے نے پریشانیِ شوق
گیت گائے ہیں محبت کو سنانے کے لئے
کُند ہے جس سے مرے دشنۂ گفتار کی دھار
ایسا جادُو بھی زباں میں ہے جگانے کے لئے

دیکھو اس جلتی ہوئی خاک پہ پتّوں کے مزار
جل بجھا جن کے جلو میں مری الفت کا چراغ
ریت پر اُڑتے ہوئے مٹتے ہوئے نقشِ قدم
جن سے ملتا نہیں بھٹکے ہوئے ماضی کا سُراغ

رات تاریک و طویل اور سسکتا سا چراغ
ہے یہی تازگیِ بزمِ محبت کا نشاں
میرے ہونٹوں پہ یہ نمکین سی فریاد کی نے
مرگِ ہستی کا علم، ان کی عنایت کا نشاں

اب کوئی فرق نہیں منظر و پس منظر میں
کس کو معلوم کہ آباد یہاں تھی دُنیا

خواب دیکھا تھا خزاں نے کہ بہار آئی تھی
اور چونکی جو سحر کو تو کہاں تھی دُنیا

مجھ سے مت کہہ کہ مجھے کوئی خدا کا بندہ
آئے گا راہ دکھانے کے لئے کوئی نہیں
تجھے دھوکا ہے مسافر کوئی بھٹکا راہی
روئے گا مجھ کو ہنسانے کے لئے کوئی نہیں

غزل

چل دوست اس الم کدۂ عنصری سے دُور
اس موت کے دھوئیں سے بھرے زندگی سے دُور

فطرت ستم شناس نہیں اس بری طرح
اے التفاتِ دوست مری بیکسی سے دُور

اے شمعِ طور تجھ کو خبر بھی ہے یا نہیں
اک شمع اور بھی ہے تری روشنی سے دُور

ڈھلتا نہیں زبان کے سانچے میں ہر خیال
نغمے تڑپ رہے ہیں مری بانسری سے دُور

اے دوست اپنی عکس نوازی مجھے بھی دے
یہ بات کچھ نہیں تری آدم گری سے دُور

ہیں راجِ ارتباطِ عناصر میں کھو گیا
انساں ہیں اپنے حلقۂ خود آگہی سے دور

اُلفت

دوست، اے دوست تجھے عظمتِ عصیاں کی قسم
اشکِ خنداں کی قسم، خندۂ گریاں کی قسم
سوزِ پنہاں کی قسم، دردِ فراواں کی قسم
غور کر غور محبت کا سزاوار ہے کون
بربطِ دل پہ تباہی کے ترانے نہ سُنا
غم میں ڈوبے ہوئے بیمار فسانے نہ سُنا
نہ سُنا عہدِ جوانی کے ترانے نہ سُنا
وقت کو دیکھ کہ کیا دیتا ہے پیغام ہمیں

یہ ترا رنگ زمانے سے مٹا دے گا مجھے
راہِ ایمانِ محبت سے ہٹا دے گا مجھے
دامنِ حرص و تعیّش میں سلا دے گا مجھے
راہِ پُرخار سے اے دوست ہٹا لے مجھ کو

مجھ کو جب آ کے جگائے گا بڑھاپا میرا
عقل، دیکھے گی پریشان تماشا میرا
ہانپتا کانپتا اُٹھے گا سراپا میرا
نقشِ پا بھی نہ جوانی کے نظر آئیں گے

ہوش آتے ہی مجھے دے گی یہ غیرت آواز
گلشنِ دہر میں اے باعثِ ننگ پرواز
تجھ کو لے ڈوبا ترے وقت کا دشمن ہمراز
اب تاسف سے پلٹتا نہیں ہر کارہ وقت

تیرے گلزار میں جب موسمِ بیداد آیا
تو نے دیکھا نہ ترے سامنے صیاد آیا
ارے بدبخت تجھے پھر نہ وطن یاد آیا؟
خاک کو اب بھی جوانوں کا لہو ہے درکار

طوطے اڑ جائیں گے ہاتھوں کے پریشاں ہوں گا
اپنے اوقاتِ محبت پہ پشیماں ہوں گا
اپنی نقّاد نگاہوں میں نمایاں ہوں گا
اپنی غفلت کے جنازے پہ کروں گا ماتم

ہیں اگر میرے لئے دوست یہ آہیں تیری
میری خاطر جو ہیں مغموم نگاہیں تیری
منتظر ہیں جو مرے پاؤں کی راہیں تیری
دونوں آ جنگ کے میداں میں کریں عمر بسر

آ جنوں خیز ترانوں کو جگاتے نکلیں
دل کی آواز پہ ہنگامے اٹھاتے نکلیں
بجلیاں سی سرِ اعدا پہ گراتے نکلیں

مجھ کو تنہائی میں آتی ہے یہ دل سے آواز

راہِ ایمانِ محبت میں فنا ہو جائیں
آ کہ ہم ہو کے فنا جزوِ بقا ہو جائیں
اپنے ہر درد کی پس پس کے دوا ہو جائیں

اپنی سوئی ہوئی قسمت کو جگائیں اے دوست

آ کے ہم خون کے دریا کی روانی دیکھیں
موت کے گھاٹ پہ تلوار کا پانی دیکھیں
آ جوانی کا ذرا جوشِ جوانی دیکھیں

ہاں یہ الفت ہے مرے دوست، یہی الفت ہے

"رات بیت چلی"

اِس طرف یہ نئی کلی چٹکی   پھانس سی روح میں کھٹکتی ہے
تھک گئی رات، رو پڑی شبنم   جھاڑیوں میں ہوا سسکتی ہے

میری محبوب رات بیت چلی

یہ زمانہ ضرور بدلے گا   زندگی آئینہ دکھائے گی
یہ تری سانس، یہ سہاگ کی لَو   میرے سینے میں تھرتھرائے گی
اجنبی نکہتوں کے سیل کے سیل   یوں تو ہر رات ساتھ لائے گی
چاند کے صحن میں ہوں ہم دونوں   یہ مگر رات پھر نہ آئے گی

میری محبوب رات بیت چلی

جاگنے کو ہے دن کا ہنگامہ   دھوپ چنگاریاں اُڑائے گی
دن کے گرد و غبار کے نیچے   رات کی لاش دبتی جائے گی

میری محبوب رات بیت چلی

نیم وا سُرخ سُرخ آنکھوں میں
عہدِ رفتہ کی نرم نرم پھوار
زرد چہرے پہ رینگتے آنسو
بکھری زلفوں میں خوابِ یادِ بہار
وقت کا دل دھڑک رہا ہے سُنو
جیسے صحرا میں گم ہوں کی پکار

مری محبوب رات بیت چلی

رکھ بھی لو میرے سر کو سینے پر
اور اسی طرح سے سحر ہو جائے
وقت کے دل کی دھڑکنیں رُک جائیں
ہر نظر کیف کی نظر ہو جائے
ہم ہوں مصروفِ التفاتِ وفا
مہ و انجم کو سب خبر ہو جائے

وہ پکاریں کہ رات بیت چلی

جاؤ اب صبح ہونے والی ہے
مجھ کو بے تاب ہی رہنے دو
جاؤ بھی بس یونہی چلی جاؤ
میری آنکھوں سے اشک بہنے دو
دل کے افسانے یونہی بنتے ہیں
لوگ کچھ کہہ رہے ہیں، کہنے دو

ہے کہاں رات، رات بیت چلی

ایک رخصت ہونیوالی سے

میں مست ہوں مرا نشہ ذرا اُترنے دے
مجھے خدا کے لئے انتظار کرنے دے
میں اپنی آئی میں مرتا ہوں مجھکو مرنے دے
حیات خام نہ رہ جائے کچھ تو کرنے دے

نہ مجھ سے کہہ کہ "مجھے اب سے بھول جا پیارے
فلک پہ دیکھ وہ دو ٹوٹتے ہوئے تارے

حسین چاندنی راتوں میں اشکبار نہ ہو
مری حیات کی مانند سوگوار نہ ہو

مری تباہی پہ اس درجہ بے قرار نہ ہو
کہیں یہ تیری محبت کا شاہکار نہ ہو

جوان وقت کو غم کی خموشیوں سے بچا
غرورِ حسن کو نیرنگیوں کی زد پہ نہ لا

درست ہے کہ تغیر کو ہے ثبات یہاں
ہر ایک ذرّہ ہے دھوکے کی کائنات یہاں
نہیں ہے محرمِ تقدیر دل کی بات یہاں
بہت ہے یہ بھی جو کٹ جائے ایک رات یہاں

نہ جانے صبح تجھے رنگ کیا دکھائے گی
نہ جانے تیرے لئے کیا پیام لائے گی

گناہ پاش اندھیرے کو جگمگائے جا
ہوس کی آنکھوں سے آنکھیں اٹھی لڑائے جا
کسی کے کھوئے ہوئے گیت گنگنائے جا
ابھی ہے وقت ترے بس میں مسکرائے جا

تو اپنی سوچ مرا کیا ہے میں تو جی لوں گا
نہ وقت بولنے دے گا تو ہونٹ سی لوں گا

میں بن کے یاد تری خلوتوں میں آؤں گا
تری گداز جوانی کو گدگداؤں گا
ضرور آؤں گا آئینہ لے کے آؤں گا
تری خوشی کو پریشانیاں دکھاؤں گا

تری بہار میں مغموم راگ برسیں گے
سہاگ گائے گی تو اور بھاگ برسیں گے

غزل

وفورِ شوق جب لکھتا ہے آزادی کی تحریریں
سنور جاتی ہیں تدبیریں، نکھر جاتی ہیں تقدیریں

فضا میں کوندنے لگتی ہیں جب خونریز شمشیریں
اذاں دیتی ہے وحشت اور جنوں کہتا ہے تکبیریں

لہو غرور کا جب ضبط سے لَو دینے لگتا ہے
غلامی خود اٹھا لیتی ہے آزادی کی تعمیریں

غریبوں کی زبوں حالی کے افسانے جو دہرائیں
نہیں مٹتیں وہ تحریریں نہیں دبتیں وہ تقریریں

ہر اک سینے میں آویزاں ہیں تصویریں تعصّب کی
لئے پھرتے ہیں شیخ و برہمن تاریک تنویریں

گلستاں میں یہی عالم ہے گر خونیں بہاروں کا
عجب کیا ہے اُگیں مٹی سے زنگ آلود شمشیریں

لہو ہر ذرّہ کی آنکھوں میں ہے اُترا ہوا لیکن
زمانہ دیر میں دیتا ہے ان خوابوں کی تعبیریں

خیالِ مہوشاں اے راجؔ اور دل کا ضیا خانہ
ارے کافر بتوں کی اور خدا کے گھر میں تصویریں

غزل

دنیا کو جو زندہ رکھتے تھے وہ آپ ہی جینا بھول گئے
سیراب تھے جن سے میخانے وہ اپنا قرینہ بھول گئے

ہم بھول میں ہیں یا تم ہی وہ ساون کا مہینہ بھول گئے
وہ دل کی دھڑکن یاد نہیں ، ماتھے کا پسینہ بھول گئے

ہم تم سے محبت کر کے اے محبوب پڑے ہیں الجھن میں
دُنیا کو ہنسانے نکلے تھے ہنسنے کا قرینہ بھول گئے

اپنوں کا تو اس میں ذکر ہی کیا دشمن کا بھی غم اپنا سمجھا
جو چاک تھا اپنے دامن میں اس چاک کو سینا بھول گئے

ہم یوں تو نہ آہیں بھرتے تھے، ہم یوں تو نہ نالے کرتے تھے
جس رنگ سے پہلے جیتے تھے اس رنگ میں جینا بھول گئے

بن پوچھے ہی غم آجاتا ہے عشرت کی سنہری راتوں میں
نادان ہیں وہ پینے والے جو آنسو پینا بھول گئے

سو بار وہاں ہم پہنچے ہیں روداد سنانے فرقت کی
نظریں جو ملیں، دل دھک سے ہوا باتوں کا قرینہ بھول گئے

تم کو تو اثر معلوم نہیں ان اپنی نشیلی آنکھوں کا
کچھ جام کو بھرنا بھول گئے کچھ جام کو پینا بھول گئے

ماضی کا تاسف، حال کا غم، اور مستقبل سے مایوسی
جس طرح سے دنیا جیتی ہے ہم آج وہ جینا بھول گئے

مکتبۂ دانش مزنگ لاہور